فہرست مضامین

تعارف

انسان کو انسان بنانے کا کام 11

قرآن سے عبرت وموعظمت کا حصول

اہم تفسیری نکات 17

مکے والوں کے عجیب عجیب اعتراضات 18

قرآنی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دینا 19

قوموں کے بارے میں سنت اللہ 20

تذکیر

اللہ کی آیتوں سے تذکیر پر زور 20

عباد الرحمٰن کی صفات 21

نشۂ ایمان اور حلاوتِ اسلامی 22

حضرت ابراہیمؑ کی دُعاء 22

حضرت نوح علیہ السلام 24

قوم عاد پر مادیت پرستی کا غلبہ اور اس کی تباہی 25

قوم ہودؑ کی سرکشی اور ہلاکت 26

حضرت لوطؑ کا اخلاقی مشن 27

بداخلاقی کا قوم کی تباہی کا باعث ہونا 27

اصحاب ایکہ کی بدمعاملگی کی وجہ سے اُن پر عذاب 28

قرآن کے بارے میں حقائق 29

سورۂ نمل 30

حضرت سلیمانؑ نے تحائف واپس کر دیئے! 31

بلقیس کا تخت اور علم الحرکت 32

حضرت سلیمانؑ کا شیش محل! 33

سُدومیت کیخلاف جہاد کی ضرورت 33

معبودِ حقیقی کون ہے؟ 34

توحید یا دہریت 36

دابتہ الارض 36

قصہ غلامی وآزادی 37

موسیٰؑ مدین کے کنوئیں پر 39

مشکلات کے وقت صرف اللہ سے مدد مانگنا 39

حضرت موسیٰ کی تربیت کا انتظام 40

کوہ طور پر اللہ کی تجلیات کا ظہور 40

عذاب الٰہی کب آتا ہے 41

ہدایت کا اللہ کے اختیار میں ہونا 42

مادہ پرستی ودینداری کا موازنہ 42

مریدان باعقیدت کا مرشدوں سے بیزاری کا اظہار 43

اللہ جسکو چاہے اپنی خدمات کے لئے مختص کرلے 43

ایک واضح حقیقت 44

قارون کی رعونت 45

دولتمندوں سے متاثر ہونے والے 46

نفسیات انسانی کا ادق تجزیہ 46

انبیاء، منصب نبوت کے اُمیدوار نہیں ہوتے 46

قرآن کے اسلوب بیان کی نوعیت	46
نجات کا سچا اور سادہ نظریہ	47
لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ	48
لواطت کے نقصانات	48
باغی قوموں کے ساتھ اللہ کا قانون	49
اللہ، عذاب کو پسند نہیں کرتا	50
نماز برائیوں سے روکتی ہے	51
امی نبیؐ۔ امتیازی خصوصیات	51
ہجرت اور اس کے ثمرات	52
توحید کا اقرار	53
انسانی فطرت کی سچی تصویر کشی	54
فیوض رحمت کی بارش	54
تعلیمات اسلامی کا عقل پر مبنی ہونا	55
فلسفہ ازواج	55
مذہب کا جدید ترین معیار	57
نماز نہ پڑھنا شرک ہے	57
سودخواروں کی دولت	58
عہد جدید کا داعی	
اس کا کردار وخصوصیات قرآن کی روشنی میں	60
داعی کے لئے وقت کے چیلنج کی نوعیت کا فہم ہونا ضروری ہے	60
نئے عالمی نظام میں مسلمان حکمرانوں کی حیثیت کا طفیلی نوعیت کا ہونا	62
داعی کی کچھ اہم صفات ایک نظر میں	62
دعوتی کام کی دو حیثیتیں	64
طاغوت کے انکار کا کام، داعی کے مقاصد میں شامل ہونا	65
داعی کی پانچ اہم خصوصیات	67
دعوت کا کام لوگوں کے دلوں پر دستک دینا ہے	68
توحید میں رسوخ کے بغیر دعوت کا کام نہیں ہوسکتا	68
اخلاق حسنہ، دلوں کو ہموار کرنے کا ذریعہ ہے	69
قلب سلیم کے حامل داعی کا یقین کے بلند مقام پر فائز ہونا	69
داعی، لوگوں سے اجر وصلہ کا متمنی نہیں ہوتا	69
داعی کی استقامت سے اس کے لئے حالات کا سازگار ہونا	70
داعی ومدعو کے درمیاں بے غرضانہ محبت کے رشتہ کا قائم ہونا	70
داعی کی شخصیت کا شفقت اور کریمانہ اخلاق کا حامل ہونا	71
داعی کا اپنی شخصیت پر صبغۃ اللہ کو غالب کرنا	72
داعی کا حکمۃ وموعظۃ حسنہ سے کام لینا	72
داعی میں نرمی کی صفت کا ہونا	73
ذکر کا داعی کا سب سے طاقتور ہتھیار ہونا	75
داعی کا، دنیا واہل دنیا سے استغنا کے مزاج کا راسخ ہونا	76
داعی کا اخلاص کے بلند مقام پر فائز ہونا	78
دعوتی کام میں خیر وبرکت کی رخصتی کا سبب	79
داعی کا امت میں تفریق کو گوارا نہ کرنے کا کردار	79
سرکش مالداروں کے مقابلہ میں غریب متلاشی حق کو ترجیح دینا	81

داعی کی اہم خصوصیت 83

سبیل المومنین کو مضبوطی سے پکڑتے رہنا 85

داعی ومزکی کا بنیادی کام لوگوں کا تزکیہ کرنا ہوتا ہے 86

تزکیہ کی اہمیت اور اس کے فوائد وثمرات

داعی وصوفی کی خصوصیات 90

ایک نظر میں

حقیقی صوفی اور اس کی خصوصیات 93

اکابر اہل اللہ کی نظر میں 95

حضرت حسن بصریؒ 96

حضرت بایزید بسطامی 98

حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ 101

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ 106

حضرت فرید الدین شکر گنجؒ 107

حضرت قطب الدین بختیار کاکی 108

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ 109

مولانا رومیؒ

مشکلات ومصائب سے بھرپور زندگی کا 112

سفر کیسے طے ہو؟

اہل علم واہل دانش ساتھی کے نام 122

ہمارا اخلاقی انحراف

مغربی اخلاقی بحران کے پس منظر میں 126

خود اعتمادی کا بحران

معاشرہ کا سلگتا ہوا مرض

مختصر ہمہ پہلو گفتگو 132

نفس کی پُرفریب ادائیں

اور ان سے بچاؤ کی صورتیں 136

صوفی کے بعض حجابات

اپنے نفسی حالات کے پس منظر میں 144

ایک قابل رشک داعی وصوفی

تعارفی جائزہ 156

تصوف وعملیات کی جدید شخصیت

مختصر تعارف 165

تعارف

انسان کو انسان بنانے کا کام

زیر نظر کتاب ہمارے نئے مضامین کے مجموعہ پر مشتمل ہے جو ''بیداری'' رسالے میں چھپتے رہے ہیں، کتاب کا نام، کتاب میں شامل مضمون ''داعی کا کردار اور اس کی خصوصیات'' کے عنوان کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔

پہلا تفصیلی مضمون مولانا محمد حنیف ندویؒ کی تفسیر قرآن ''سراج البیان'' کے دوڈھائی پاروں کے انتخاب پر مشتمل ہے، اس سے قرآنی پیغام سے دلوں میں حرارت، ایمان میں تازگی، دنیا کی ناپائداری کے احساس میں پختگی اور آخرت کے استحضار میں مدد ملے گی۔

داعی کا کردار وخصوصیات والے مضمون میں داعی کے منصب پر فائز افراد کی خصوصیات واضح ہوں گی، چونکہ صوفی بھی داعی ہوتا ہے، بلکہ ہماری نظر میں سب سے بڑا داعی صوفی ہی ہوتا ہے، جو دوسروں کی تربیت وتزکیہ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے، اس لئے یہ مضمون انشاء اللہ جدید داعی وصوفی کے لئے مفید ثابت ہوگا، اس لئے کہ اس میں داعی کی خصوصیات قرآن کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں۔

کتاب میں شامل بعض مضامین میں ہم جیسے خام داعیوں وخام صوفیوں کی کمزوریوں وحجابات کی نشاندہی کی گئی ہے، جو حجابات دعوت کے فروغ اور تزکیہ وتربیت کے کام میں رکاوٹ کا موجب بن گئے ہیں۔

''حقیقی صوفی اور اس کی خصوصیات اکابر اہل اللہ کی نظر میں'' کے عنوان سے مضمون میں جہاں ان اہل اللہ کے نفس مطمئنہ کے مشاہداتی سفر کی جھلکیں نظر آتی ہیں، وہاں حقیقی داعی وحقیقی صوفی کو جانچنے وپرکھنے کے معیار بھی سامنے آتے ہیں اور ان کے بیان کردہ نکات میں ہر دور کے داعی وصوفی کو وہ اہم اصول اور ہدایات ملتی ہیں، جو حب جاہ وحب مال جیسے امراض سے بچنے اور نفسی قوتوں کو اللہ ورسول کے تابع بنانے کے لئے ناگزیر ہیں، اگرچہ یہ اصول اور بنیادی نکات قرآن وسنت میں پوری طرح موجود ہیں، لیکن اکابر اہل اللہ نے نفسی قوتوں کے مشاہداتی مراحل سے گزرنے کے بعد ان کو خون جگر اور دل کی گہرائیوں سے پیش کیا ہے، آج کے داعی وصوفی کے لئے یہ مضمون اہمیت کا حامل ہے۔

دعوت کا کام دوطرح سے ہوتا ہے، ایک زبانی وتحریری تلقین سے۔ دوم دلوں کو متاثر کرکے، افراد کو تزکیہ کی راہ پر گامزن کرنے سے، ان دونوں قسم کے دعوتی کام کی ضرورت ہے، لیکن اس وقت مادہ پرستی کا جو نظام ہم پر مسلط ہے، اس میں محض زبانی نوعیت کے دعوتی کام سے تبلیغ کا کام موثر نہیں ہوسکتا اور اصلاح کی مطلوبہ صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔

تزکیہ ایسی چیز ہے، جس سے فرد وافراد کی اخروی نجات وابستہ ہے اور دنیا میں بھی بہتر اور پاکیزہ انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا سلیقہ وابستہ ہے۔ حقیقی داعی وہ ہوتا ہے، جو صاحب تزکیہ بھی ہوتا ہے اور جسے لوگوں کی دین ودنیا کی بھلائی کی فکر دامنگیر ہوتی ہے، بلکہ وہ اس کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ اس وقت مادی سرگرمیوں کی زیادتی اور مادہ پرستی کی عمومی فضا کی وجہ سے تزکیہ کی فکر اور نفس کو آتش عشق کے مراحل سے گزارنے کی طلب مفقود ہوگئی ہے، دوم یہ کہ حقیقی داعی وحقیقی صوفی ان حالات میں اس حدیث پر گامزن ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ جب ایسا دور آجائے کہ ہر شخص اپنی رائے پر بضد ہو تو تم دوسروں کی فکر چھوڑ کر، اپنی فکر میں لگ جاؤ۔

اگرچہ معاشرہ میں اہل تصوف کا ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے، جو لوگوں کے تزکیہ کے کام میں مصروف ہے، یہ داعی وصوفی ملک کے ہر علاقہ میں موجود ہیں، لیکن معاشرہ اس طرح کے داعیوں وصوفیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، اس لئے وہ معاشرہ میں تحرک پیدا کرنے میں کامیاب نہیں۔ اس طرح کے صوفی معاشرہ میں اجنبی بن کر رہ گئے ہیں۔

اب معاشرہ میں روحانیت اور بزرگی کی مسند پر عام طور پر جو افراد فائز ہیں یا معاشرہ میں بزرگی کا جو معیار متعارف ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ بزرگ وہ ہے، جو بڑی گاڑی رکھتا ہو، بڑے بنگلہ میں رہتا ہو اور ہر دوچار ماہ کے بعد اپنے گروہ کے ساتھ عمرہ پر جانے کا معمول رکھتا ہو اور خاص افراد اور مالداروں کے علاوہ عام لوگوں سے ملنے کے اس کے دروازہ مسدود ہوں، بزرگی کے اس نئے معیار کا مظاہرہ اب عام ہونے لگا ہے۔

جس معاشرہ میں غربت کے مناظر عام ہوں، لوگ روٹی کے محتاج ہوں، علاج ومعالجہ کے لئے وسائل سے محروم ہوں، وہاں تصوف وصوفیت کے نام پر اس طرح کا کردار صوفیت کے شان کے منافی ہے۔

یہ ایسے حالات ہیں، جس میں معاشرہ میں حقیقی دعوتی کام اور افراد کی اصلاح وتزکیہ کا کام بُری طرح متاثر ہے، جس کی وجہ سے معاشرہ میں خلا موجود ہے اور سنگ دلی، مفاد پرستی، قساوت قلبی، کاروباری بددیانتی، ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی قیمت پر آگے بڑھنے کی روش، غریبوں اور بے کسوں کو ان کی حالت زار پر چھوڑنے کی اداؤں کی فضا غالب ہے۔

حقیقی داعیوں واہل اللہ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے فروخت کردیا تھا، دنیا سے استفادہ کے سلسلہ میں ان کا تعلق بقدر ضرورت ہی محدود رہا ہے، اس سے زائد نہیں۔ دین کی خدمت، لوگوں کی اصلاح وتربیت اور تزکیہ اور ان کے کام آنا، یہی ان کی زندگیوں کا مقصود رہا ہے۔

موجودہ دور میں عام طور پر بزرگی کے اس معیار اور حقیقی داعی واہل اللہ کے بنیادی اصولوں کا ادراک سلب ہوگیا ہے، جو بڑی اذیت کی بات ہے۔

زیر نظر کتاب میں داعی وحقیقی صوفی کے کردار کے حوالے سے اس طرح کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور داعی وبزرگی کی صفات، خصوصیات، اور ان کے معیار زندگی کو پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے، تاکہ کم از کم بزرگی کے حقیقی خطوط ونقوش کا ادراک تو قائم رہے۔

(۲)

ایک دارالعلوم کے مفتی ومہتمم جو ممتاز اہل اللہ بھی ہیں، وہ دورہ حدیث کے طلبہ کو یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ انہوں نے ظاہری علوم کی تحصیل میں آٹھ سال صرف کئے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اب تمہیں باطنی علم (جو تزکیہ وتقویٰ، ایمان ویقین کی پختگی، اور اللہ کی محبت ومعرفت سے تعلق رکھتا ہے) کسی اہل اللہ سے وابستہ ہوکر بیس سال تک اس کے لئے مجاہدے کرنے پڑیں گے، یہ ظاہری علم تمہارے لئے اس کے بعد ہی صحیح طور پر نافع ثابت ہوگا۔ ممتاز فاضل مفتی ومہتمم صاحب کی یہ نصیحت ووصیت ایسی ہے، جو بہت اہم ہے۔

ممتاز فاضل کی طرف سے طلبہ کو یہ تاکید وہی شخصیت کرسکتی ہے، جو نفسی قوتوں اور اصلاح نفس کے مدوجزر سے گزری ہو اور جو نفسی قوتوں کو طویل عرصہ تک آتش عشق میں جلاکر، فنائیت کے مراحل طے کرچکی ہو اور جو شرف انسانیت، آداب انسانیت اور سلیقہ عبدیت کی حامل ہو۔

ہماری تاریخ میں حقیقی صوفی نے اپنے اپنے دور میں انسان کو انسان بنانے کا کام سرانجام دیا ہے، نفرتوں کو محبت میں تبدیل کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے، اپنے کردار اور اپنی روحانیت سے ہر سطح کی قیادت پر اثر انداز ہوکر، ان کی صلاحیتوں کو ملت کے مفاد میں استعمال کرنے کی کاوش کی ہے، یہ ہماری تاریخ ہے اور یہی ہمارا تسلسل ہے۔

اس دور کا چیلنج ایسا ہے، جو سب سے بڑا چیلنج ہے۔ مادہ پرستی کی عالمی قوتوں کی کاوشوں سے ہماری نسلوں کا تہذیبی تسلسل خطرہ میں ہے، ان حالات میں عہد جدید کا صوفی (جو داعی بھی ہوتا ہے) اسے زیادہ مؤثر کردار ادا کرنا ہے۔

(۳)

میڈیا نے ہماری جدید نسلوں کے لئے معلومات ومشاہدات کا دروازہ کھول دیا ہے، مدرسوں اور خانقاہوں میں ہونے والے اعمال اور مظاہر وکردار اب مدرسوں وخانقاہوں تک محدود نہ رہے، بلکہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ دنیا کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک کروڑہا انسانوں کے سامنے آرہے ہیں۔ جدید نسلیں اہل تصوف واہل مذہب کے بارے میں بہت حساس ہیں اور وہ ان کے کردار کا باریک بینی سے جائزہ لے رہی ہیں، نیز وہ انہیں مشہور اکابر بزرگوں (جن کے وقت کے بادشاہوں سے بے نیازی اور فقر کے قصے انہوں نے سن رکھے ہیں) کے کردار کی روشنی اور مثالی صورت میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے کردار سے ہی ان کے لئے فکری وعملی خطوط متعین ہوتے ہیں اور ان میں تاثیر پذیری کا

عمل شروع ہوتا ہے۔

معلومات ومشاہدات کے اس جدید پس منظر میں اگر اہل تصوف، سرمایہ داروں اور مالداروں والی شان ومان کی زندگی کا مظاہرہ کریں گے تو ان کا یہ کردار اثرات کے اعتبار سے محدود نہ ہوگا، بلکہ ان کا یہ کردار لاکھوں افراد کے فکر ونظر کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنے گا اور انہیں اسلام کے روحانی نظام سے قریب کرنے یا دور کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

اہل تصوف کو اس نکتہ کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے، ہم جو خود اہل تصوف کا حصہ ہیں۔ وہ اگر اہل تصوف کے اس کردار کو زیر بحث لاتے ہیں تو وہ خود ہمارے لئے شدید تکلیف کا موجب ثابت ہوتا ہے، لیکن چونکہ تنقید اور خود احتسابی کے بغیر چارہ کار نہیں، اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی غلطیوں کی نشاندہی کرنی پڑتی ہے۔ مقصود سلف سے مطابقت پیدا کرنی ہے، تاکہ اہل تصوف کے رونقِ کردار کی وجہ سے اسلام کا سلف کا تسلسل جاری وساری رہ سکے۔

(۴)

معاشرہ میں بہت سارے کام ہیں، جو اہل تصوف اگر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ افراد معاشرہ کو دینی واخلاقی طور پر سنبھالنے کا کام ہے، علمی، فکری اور دعوتی محاذ پر درپیش چیلنج کو سمجھکر، ان سے مقابلہ کا کام ہے، عالمی استعمار کی طرف سے نئی نسل کو اپنے جال میں پھنسوا کر، انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے بچانے کا کام ہے، ایسے علمی، فکری اور تعلیمی اداروں کو مستحکم کرنے کا کام ہے، جو ملک کو ہر سطح کی قیادت وسیاست فراہم کرنے میں کردار ادا کر سکیں، دینی ومذہبی گروہوں میں فروعی اختلافات کی بنیاد پر بڑھتے ہوئے اختلافات کو کم کرکے مفاہمانہ ذہن پیدا کرنے کا کام ہے۔ ہر مکتبہ فکر کے دینی طبقات کے درمیان احترام کی فضا پیدا کرنے کا کام ہے اور انسان کو اچھا انسان بنانے کا کام ہے۔

یہ سارے کام ایسے ہیں، جو سچی روحانیت اور بہتر علمی صلاحیتوں کے حامل صوفی اگر چاہیں تو سرانجام دے سکتے ہیں اور اس کے لئے وہ بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں مروجہ داعی وصوفی پر جو تنقید ہوئی ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ ان کی جدوجہد میں سطحیت شامل ہوگئی ہے۔ یعنی افراد میں سچی روحانیت پیدا کرکے، ان میں پاکیزہ انسان بنانے کی بجائے کیفیات کو مقصود سمجھنے، ظاہری تبدیلی کو حرف آخر سمجھنے، ذہنی وفکری محدودیت پیدا کرنے، اپنے گروہ سے وابستگی کو مستحکم کرنے، اپنے ساتھ وابستہ افراد میں امت پن کے تصور کو متاثر ومجروح کرنے، اسلام اور ملت کے خلاف عالمی کفر کی منصوبہ بندی کو نہ سمجھنے اور مالداروں سے مشابہت پیدا کرنے جیسی کمزوریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرما کر، ہماری ان کی کمزوریوں کو دور فرمائے نیز اللہ تعالیٰ اس کتاب کو پڑھنے والوں اور خود اس سیاہ کار کے لئے نافع بنائے۔

۲۶ اپریل، ۲۰۱۷ء — **محمد موسیٰ بھٹو**

قرآن سے عبرت وموعظت کا حصول

اہم تفسیری نکات

مولانا محمد حنیف ندویؒ

انتخاب: محمد موسیٰ بھٹو

قرآن، ایسی کتاب ہے، جس میں انسانوں کی اصلاح، تزکیہ، زندگی بھر کے معاملات میں ان کی رہنمائی، انفرادی واجتماعی نظام کی درستگی، بندوں کی اپنے خالق اور دوسرے بندوں سے تعلقات کے استحکام اور دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی زندگی کی نجات کے لائحہ عمل پر مشتمل کتاب ہے۔قرآن میں وہ سارے علوم موجود ہیں،جو خالق کی تخلیق کا شاہکار ہیں۔ رہتی دنیا تک قرآن سے وہ اسرارورموز ظاہر ہوتے رہیں گے، جس سے اہل دانش سراپا حیرت درحیرت ہوتے رہیں گے۔

قرآن کا سب سے بنیادی ہدف انسان کی اصلاح اور اس کا تزکیہ ہے، تاکہ وہ اس دنیا میں اللہ کے وفادار اور مہذب بندے کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے اہل ثابت ہو سکے اور ابدی زندگی میں اللہ کی بنائی ہوئی جنت کا مستحق ہوسکے۔

اس موضوع پر قرآن کی بیسیوں تفاسیر موجود ہیں، ہر مفسر نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق قرآن سے بے شمار قیمتی نکات نکال کر، پڑھنے والوں کے لئے رکھدیئے ہیں۔ اس اعتبار سے ممتاز علماء کی طرف سے لکھی گئی تفاسیر کا مطالعہ فہم قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔

ہماری نظر میں اس دور میں مولانا محمد حنیف ندویؒ کی ''سراج البیان'' کے نام سے لکھی گئی تفسیر افادیت کے بہت سارے پہلو رکھتی ہے، اس کے مطالعہ سے جہاں انسانی نفسیات کے حوالے سے قرآن سے رہنمائی ملتی ہے، وہاں انسان کی اجتماعی ومعاشرتی زندگی کے نقطہ نگاہ سے بھی بہت قیمتی نکات معلوم ہوتے ہیں۔ سابقہ انبیاء کرام نے اپنی اپنی قوموں کے سامنے جس دردمندی سے دعوت پیش کی، اس دعوت کو عام طور پر ان قوموں نے جس طرح مسترد کیا، اس تفسیر میں قوموں کی نفسیات میں موجود فساد کی بھی مؤثر طور پر نشاندہی کی گئی ہے۔

جدید دور میں علوم وفنون نے جس ذہنی وعلمی سطح کو فروغ دیا ہے اور جن خطوط ونقوش پر ذہن سازی کی ہے،''سراج البیان'' اس ذہنیت کے حامل افراد کے لئے نہایت مفید وکارآمد تفسیر ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کی شخصیت ہمہ جہتی صلاحیتوں وصفات کی حامل شخصیت تھی،فکر وفلسفہ کے مطالعہ کے اعتبار سے موصوف اس دور میں طبقہ علماء میں منفرد نوعیت کی حامل شخصیت تھی، ان کی کتابیں تعلیمات غزالی، افکار غزالی، افکار ابن خلدوں، تعلیمات ابن تیمیہ، اساسیات اسلام وغیرہ ایک ممتاز عالم دین کی شاہکار کتابیں ہیں۔

مولانا کی تفسیر''سراج البیان'' عرصہ سے مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔ (ان سطور کے راقم نے ۳۵ سال پہلے لاہور سے چھوٹی سائیز میں پانچ جلدوں پر مشتمل تفسیر ایک مکتبہ سے لی تھی، اب معلومات کی تو علم ہوا کہ اس تفسیر کی کوئی نئی اشاعت طبع نہیں ہوئی۔

''سراج البیان'' کی اہمیت کے پیش نظر ہماری خواہش ہے کہ اس تفسیر کا ایک بھرپور انتخاب تیار ہو، تاکہ اصلاح کا ذوق رکھنے والے علمی مزاج کے حامل افراد کی تسکین کا سامان ہو، انشاء اللہ یہ کام جلد ہی شروع ہوگا۔فی الحال تفسیر کے کچھ حصہ کا انتخاب کیا ہے۔ جو زیر نظر کتاب میں شامل کیا جارہا ہے، یہ انتخاب ''انیسویں، بیسویں اور اکیسویں پارے تک کا ہے۔ **(محمد موسیٰ بھٹو)**

مکے والوں کے عجیب عجیب اعتراضات

ا۔مشرکین مکہ کا نبوت وبعثت کے متعلق اعتراضات کرنا مشہور ہے،دراصل وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضور کی فضیلت اور بزرگی کو تسلیم کریں۔

یہ بات اُنکے لئے بہت گراں تھی کہ وہ اپنی نخوت اور غرور طبعی کو بالائے طاق رکھ کر یہ تسلیم کریں کہ حضور ان میں سب سے زیادہ بہتر اور اعلیٰ انسان ہیں، اس لئے طرح طرح کے

اعتراضات تراشتے رہتے تھے کبھی کہتے، آپ چونکہ انسان ہیں، اسلئے عہدہ نبوت اور رسالت کے لائق نہیں، کبھی کہتے کہ آپ کے پاس آسمان سے خزائن نازل نہیں ہوتے۔ اس لئے آپ عند اللہ معزز و مفتخر نہیں۔ اور کبھی کہتے کہ ہم فرشتوں کو دیکھنا چاہتے ہیں پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہتے کہ ہم کو خدا برملا دکھایئے۔

اس آخری بات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ بزعم خود اپنے کو برتر اور اعلیٰ سمجھتے ہیں اور اسی لئے نہایت سرکش ہو رہے ہیں۔

قرآنی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دینا

یعنی ایک طرف مشرکین ومنکرین افسوس کا اظہار کریں دوسری جانب اللہ کا رسول کھڑا ہوگا۔ اور کہے گا اے اللہ میں نے ہر چندان لوگوں کو قرآن کی جانب بلایا۔ اور صراط مستقیم کی دعوت دی۔ مگر ان لوگوں نے ہمیشہ روگردانی کی اور قرآنی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، اس لئے آج ان سے بھی ایسا ہی سلوک ہو کہ یہ تیری عنایتوں اور مہربانیوں کے امیدوار نہیں اور تیری طرف سے بالکل بے التفاتی کا اظہار ہو۔ جس طرح انہوں نے تیری کتاب کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسی طرح اب انکی معروضات نا قابل اعتناء سمجھی جائیں۔

آیت مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، اسمیں وہ مسلمان بھی داخل ہیں، جنہوں نے عملا قران کو ترک کر رکھا ہے۔ اور انکی زندگی یکسر غیر قرآنی زندگی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص قرآن کو پڑھکر فراموش کر دیگا اور پھر اس کو کبھی نہ دیکھے گا۔ قرآن، قیامت کے روز اللہ سے کہیگا کہ اے اللہ، تیرے اس بندے نے مجھے بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ اس لئے میرے اور اس کے درمیان فیصلہ فرمایئے یعنی ہر مسلمان سے پوچھا جائیگا کہ اُس نے قرآن پڑھا اور پڑھ کر اس پر عمل کرنیکی کوشش کی یا دنیا کی الجھنوں میں پھنسا رہا اور سب کچھ بھلا بیٹھا۔

قوموں کے بارے میں سنت اللہ

ان آیات میں اللہ کے اس قانون جاریہ کی تشریح ہے کہ جب قوموں کے پاس اللہ کے رسول آئیں اور وہ انکو صراط مستقیم کی طرف دعوت دیں اور وہ ان کو تسلیم نہ کریں اور کج روی کو ترجیح دیں، وہ پاکبازی کی جانب بلائیں اور ان کو فسق وفجور پسند ہو تو اس وقت عذاب الٰہی آتا ہے اور ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور فرعون کو دعوت دی کہ وہ بنی اسرائیل پر مظالم ڈھانا چھوڑ دے، اور ہر چند معجزات وخوارق سے اسکے حجاب کبر وغرور کو اسکی آنکھوں سے دور کرنیکی کوشش کی، مگر ناکامی ہوئی۔ اسکو اپنی مادی طاقت پر بڑا فخر تھا، اسلئے حقائق کو بصیرت کی آنکھ سے نہ دیکھ سکا اور غرق ہوگیا۔ نوح کی قوم تقریبًا ہزار سالہ تبلیغ واشاعت کے باوجود نہ سنبھلی اور طوفان میں غارت ہوگئی۔ عاد اور ثمود کی بستیاں انکار اور سرکشی کی وجہ سے اُلٹ گئیں اور اور اصحاب رس تباہ ہوگئے اور مٹ گئے۔ یہ کیوں، اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ کے پیغام کو ٹھکرادیا۔ اس کے رسول کو اذیتیں پہنچائیں۔ اور اللہ اور اس کے دین کی مخالفت کی۔

تذکیر

اللہ کی آیتوں سے تذکیر پر زور

قرآن حکیم دلائل وبراہین کا بے نظیر مجموعہ ہے۔ اس میں ہر نوع اور ہر طبقے کے لوگوں کے لئے تسکین کا بہتر اور وافر سامان موجود ہے، یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس میں دعوت واشاعت کے کسی طریق کو اُٹھا نہیں رکھا گیا، اس میں حکمت وفلسفہ بھی ہے۔ اور نفسیات انسانی کی عکاسی بھی، معقول اور ٹھوس دلائل بھی ہیں اور اقوام وملل کے حالات بھی۔ تعلیمات بھی ہیں اور مشاہدات بھی۔ یعنی رشد وہدایات کے جس قدر ممکن طریقے تصور میں آسکتے ہیں، وہ سب اس میں موجود ہیں۔

ان آیات میں مشاہدات فطرت کا بیان ہے اور تذکیر بآلاء اللہ کے اُصول پر ان لوگوں کو دعوتِ ایمان ہے، جو غور وفکر کے عادی ہیں۔

ارشاد ہے کہ دیکھو ہم نے انسانوں کے سُکھ اور آرام کے لئے آفتاب پیدا کیا۔ اُس کی وجہ سے ساری کائنات میں روشنی پھیل جاتی ہے اور ایک عجیب خوشگوار فضا پیدا ہوجاتی ہے، اگر وہ نہ ہوتو دنیا میں تاریکی وظلمت چھا جائے، کیا اسی طرح کفر کی ظلمتوں اور تاریکیوں کو دور کرنے کے لئے کسی آفتابِ ہدایت کی ضرورت نہیں؟

ہم نے رات پیدا کی ہے کہ وہ تمام عیوب کو لباس کی طرح ڈھانگ لیتی ہے۔ اور نیند کو آرام کرنے کے لئے بنایا۔ نیز دن کو پیدا کیا۔ جس میں تم اُٹھ کھڑے ہوتے ہو؟ تو کیا موت کی نیند سے بیداری اور بعثت ممکن نہیں۔

اور ہم خوشخبری دینے والی ہواؤں کو بھیجتے ہیں۔ جو بارانِ رحمت کی خبر دیتی ہیں۔ اور آسمان سے پاک وصاف پانی برساتے ہیں کہ خشک اور مُردہ زمینیں اس کی وجہ سے زندہ ہوجائیں، اور حیوانات اور انسان اس پانی سے استفادہ کریں۔

تو کیا دل کی خشک اور مُردہ زمینیں الہام ووحی کی بارش کے پانی سے تر تازہ نہ ہوں گی؟یعنی تم ان تمام معجزاتِ تکوین پر غور کرو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ حکیم وحلیم خدا اپنے بندوں پر کس درجہ مہربان ہے۔

ارشاد ہے کہ ہم چاہتے تو ہر بستی میں پیغمبر بھیجتے۔ اور آپ کی سہولت وآسانی ہر آئینہ مدنظر رکھتے۔ مگر طے یہ تھا کہ ان تمام رسالت کی ذمہ داریوں کو آپ تنہا نہ اٹھائیں، اس لئے اپنے اس منصب جلیل کو دیکھتے ہوئے منکرین کی خواہشات کا احترام نہ کیجئے۔ اور انکی جہالت اور سرکشی کے خلاف زبردست جہاد کیجئے۔

اس کے بعد پھر مختلف نعمتوں کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ دیکھو، بعض دفعہ ایک دریا ہوتا ہے اور اس میں دوقسم کے دھارے الگ الگ اور ممتاز طریق پر بہتے ہیں، ایک دھارا میٹھا اور شریں ہوتا ہے۔ اور دوسرا کڑوا اور کھاری اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ ہوتی ہے۔ جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتی۔

کیا یہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور زبردست قدرت پر حیرت انگیز دلیل نہیں۔ آخر ان دونوں دھاروں کو آپس میں ملنے سے کس نے روک رکھا ہے۔ اور کس نے ان دونوں میں الگ الگ خواص اور رنگ پیدا کئے ہیں؟ یہ بھی اس کی قدرتِ باہرہ ہے کہ ایک قطرۂ آب سے آدمی پیدا کرکے اُسے کنبوں اور قبیلوں والا بنا دیتا ہے۔

عباد الرحمٰن کی صفات

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عباد الرحمٰن کی صفات بتائی ہیں۔ یعنی وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کے صحیح معنوں میں بندے ہیں اور ان کو رحمٰن کی غلامی اور نیازمندی کا فخر حاصل ہے؟

ارشاد ہے کہ وہ دنیا میں ظلم ومعصیت سے علو وبرتری نہیں چاہتے۔ نہایت نرم اور مرنجاں مرنج ہوتے ہیں۔ عجز وانکسار کا یہ عالم ہے کہ چلتے ہیں تو ہولے ہولے، وقار اور حشمت کے باوجود ان میں شیخی اور گھمنڈ نہیں ہوتا۔ متانت اور سنجیدگی کو مدنظر رکھتے ہیں اور اپنے وقت کی قیمت کو پہچانتے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے خوب آگاہ ہوتے ہیں، جن میں جہالت ہوتی ہے۔ اسلئے جہاں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے تو سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے دلوں میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے جذبات موجزن ہوتے ہیں اور انکا شعار ہوتا ہے کہ رات کی تاریکیوں میں اللہ کے ذکر سے کسبِ انوار کرتے ہیں۔ اور رات کا اکثر حصہ سجُود وقیام میں گزار دیتے ہیں۔ مگر اپنی عبادت پر انہیں ناز نہیں ہوتا۔ ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے ہیں۔ اور عذاب خدا سے پناہ مانگتے رہتے ہیں۔

ان کے مزاج میں توازن واعتدال کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو بے دریغ ہوتے ہیں، ہاں معصیت کے کام میں ایک حبہ بھی خرچ نہیں کرتے۔ اور نہ یہ حقوق اللہ میں خرچ کرنے سے کوتاہی کرنے یا دل میں کوئی تنگی یا ضیق محسوس کرتے ہوں۔

نشۂ ایمان اور حلاوتِ اسلامی

فرعون نے جب دیکھا کہ جادوگر، موسیٰ کے معجزات وکمالات کے قائل ہوگئے ہیں اور غیرمتوقع طور پر انہوں نے اسلام قبول کرلیا ہے تو سخت گھبرایا اور غصّے سے بے تاب ہوگیا۔ کہنے لگا کہ تم نے بغیر میری اجازت کے موسیٰ وہارون کے مذہب کو قبول کرلیا ہے، معلوم ہوتا ہے یہ بڑا جادوگر ہے اور تمہارا استاد ہے۔ تم نے پہلے سے آپس میں سمجھوتہ کر رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ موسیٰ کے غالب آتے ہی تم نے تبدیلی مذہب کا اعلان کردیا۔ یہ بہت بھاری جُرم ہے۔ میں تمہیں سخت عبرتناک سزادوں گا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں آرا سے ترچھے کٹوا دوں گا۔ اور تم سب کو بالآخر سولی پر چڑھوا دوں گا۔ انہوں نے اس دھمکی کو سنا اور کامل بے خوفی سے پکار کر کہا۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، ہم اگر سولی پر مریں گے تو اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور ہم دل سے چاہتے ہیں کہ اس طرح کی موت سے ہمارے سابقہ گناہوں کا کفارہ ہوجائے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں کہ ایمان میں پیش قدمی کی وجہ سے ہماری لغزشوں اور ہمارے گناہوں کو عفو وکرم کی نظر سے دیکھے گا اور ہمیں بخش دے گا۔

غور فرمایئے کہ ایمان کی حلاوت کس درجہ زبردست ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں زندگی کی شیرینی بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ کتنا بڑا انقلاب ہے جو ان لوگوں میں پیدا ہوگیا۔ یا تو یہ مقابلہ کے لئے آئے تھے۔ دلوں میں بغض وعناد تھا، دشمنی اور عداوت تھی۔ اور یا اب یہ فدائیت اور جانبازی ہے کہ فرعون آنکھیں دکھاتا ہے، اور ان کے دلوں میں قطعًا خوف پیدا نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا وہ مرتبہ اور مقام ہے، جو تبدیلی وتمول کا باعث ہوتا ہے۔ اور جو مسلمان کو دل ودماغ کے لحاظ سے بالکل بدل دیتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ ایمان مسلمان کو دوسرا دل اور علیحدہ دماغ عنایت کرتا ہے، جس میں بجز اللہ کی محبت اور شیفتگی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ کی دُعاء

حضرت ابراہیمؑ جب اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور پیش کر چکے۔ اور حمد وثنا کے فرائض ادا کر چکے تو اپنے باپ کے لئے دُعا کی۔

فرمایا۔ اے مولا میرا باپ راہ راست پر گامزن نہیں ہے، اُس کی لغزشوں سے درگزر

فرمایئے۔ اور اُس دن کی رُسوائی وذلت سے بچایئے، جس دن نہ مال ودولت کے انبار کام آسکیں گے۔ اور نہ بیٹے ہی سودمند ثابت ہوں گے۔

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ. سے مقصود یہ ہے کہ وہاں عالم حشر میں بجز سلامتی قلب کے اور کوئی چیز مخلصی اور نجات کا باعث نہیں ہوسکتی۔ اور سلامتی قلب تعبیر ہے۔ تذکیر باطن سے اخلاق کی بلندی اور رفعت سے عقائد کی صحت اور پاکیزگی سے۔

گمراہوں اور مشرکوں سے کہا جائے گا کہ وہ تمہارے معبودانِ باطل کہاں ہیں۔ کیا آج وہ اس بے چارگی اور بے کسی میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور تم کو جہنم کے عذاب سے بچا سکتے ہیں اور یا وہ خود کو اللہ کے غضب سے اور غصہ سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

لاکلام آج کسی شخص میں جرأت نہیں کہ اس کے غیظ وغضب کا سامنا کر سکے۔ آج تمام معبودانِ باطل کو ان کے عقیدتمندوں کے ساتھ جہنم میں اوندھے منہ گرادیا جائے گا۔ اور تمام ابلیسی لشکر آگ میں جھونک دیا جائے گا، آج وہ لوگ معلوم کریں گے کہ یہ بُت پرستی محض فریب نفس کی نیرنگیاں تھیں۔ ورنہ حاکم وقاہر اور مختار وقادر ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ یہ لوگ اس وقت اپنے مقتداؤں اور گمراہ معبودوں سے کہیں گے کہ واللہ، ہم نے تم کو خدا کا شریک قرار دے کر، سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ یقیناً ہم گمراہ ہو گئے۔ اور ہماری گمراہی کا موجب یہ ہمارے پُر معاصی پیشوا ہی ہیں۔ یعنی وہ بڑے بڑے مذہبی جرائم پیشہ لوگ، جنہوں نے توحید کی روشنی سے ہمیں ہمیشہ بیگانہ رکھا اور یہ حالت ہے کہ ان مدعیانِ طریقت میں سے کوئی شخص جرأتِ سفارش نہیں کرتا، وہ لوگ جو دنیا میں ہم کو تسلیاں دیتے تھے اور اپنے کو نجات ومخلصی کا اجارہ دار سمجھتے تھے اور وہ جو اپنے اور اپنے مریدوں کے سوا سب کو جہنمی قرار دیتے تھے، آج خود عذاب الٰہی کا شکار ہیں اور اُن کی زبانیں گنگ ہیں۔ اُن سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ اپنے عقیدتمندوں اور نیازمندوں کی طرف سے کچھ کہہ سُن لیں، دوستی اور آشنائی کے تمام تعلقات منقطع ہیں۔ یہ لوگ اس وقت اس خواہش کا اظہار کریں گے کہ اگر اب ہمیں دنیا میں جانے کا موقع دیا جائے تو ہم پکے مومن ثابت ہوں گے۔ ارشاد ہے کہ اب اس بے مائگی اعمال کی صورت میں ان کو حقیقت حال کا احساس ہونا محض بیکار ہے، اور اس پورے قصہ میں عبرت وتذکیر کی ایک بہت بڑی نشانی ہے، مگر ان لوگوں کے لئے جو دولت ایمان سے بہرہ ور ہیں۔ یہ مشرکین مکہ ان کوائف کو سُن کر بھی اسلام کی سچائیوں کا اعتراف نہیں کرتے اور ان کے دلوں سے تبدیلی اور اصلاح کی استعداد یکسر مفقود ہوچکی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام

ان آیات میں حضرت نوحؑ کا ذکر ہے، جنہوں نے حیرت انگیز استقلال کے ساتھ قوم کے کفر اور ان کی سرکشی کا مقابلہ کیا اور تقریباً ایک ہزار سال تک مسلسل رشد وہدایت کی دعوت دی اور اپنے خلوص اور محبت سے مجبور ہو کر، بکمال دلسوزی منکرین حق کو سچائی کی طرف بُلایا۔ ان کا زمانہ ٹھیک طور پر تو معلوم نہیں، تاریخ کی اصطلاح میں یہ آدم ثانی ہیں۔ البتہ بائبل اور قرآن سے ان کے تبلیغی کارناموں پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس دور کے داعی ہیں، جب کہ انسانوں کی عمریں طبعاً بہت زیادہ طویل ہوتی تھیں۔

ارشاد ہے کہ حضرت نوحؑ نے قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم کیوں پاکبازی کی زندگی بسر نہیں کرتے۔ کیا تمہارے دلوں میں اللہ کا ڈر نہیں ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئیے، کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور تمہارے لئے زبردست امانت دار اور معتمد ہوں۔ مَیں تم کو اللہ سے اتقا وخشیت کی دعوت دیتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ میری اطاعت شعاری میں سعادت دنیوی واُخروی حاصل کرو۔ اور اس پر میں پیشہ ور قائدین کی طرح کسی سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، کیونکہ میرا یقین ہے کہ اللہ جو تمام کائنات کا مالک اور پروردگار ہے، مجھے فراموش نہیں کرے گا۔ میں اپنی کسی حاجت کے لئے تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، بلکہ مخلصانہ دلسوزی اور محبت سے کہتا ہوں، کہ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت قبول کرو۔

نوحؑ کے مخاطبین نے جب یہ وعظ سُنا تو کہنے لگے کہ ہم تمہارے دین کو قبول کر کے ذلیل اور کمینے نہیں بننا چاہتے، کیونکہ جس قدر لوگ تم پر ایمان لائے ہیں، وہ سب کے سب ارذل پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت نوحؑ نے فرمایا۔ کہ کبر وغرور کے نشہ میں چُور سرمایہ دارو۔ ایک داعی حق وصداقت کو لوگوں کے پیشوں سے کیا بحث؟ کیا عزت ووجاہت کا تعلق صرف دولتمندی اور حرام خوری سے ہے۔ کیا وقار وحشمت، فسق وفجور کا نام ہے اور کیا تم محض اس لئے رذیل نہیں ہو کہ تمہارے پاس باوجود تمام جرائم اور گناہوں کے دولت ہے:

ارشاد ہے کہ ان لوگوں کا معاملہ اللہ سے ہے۔ میں کوئی حق نہیں رکھتا کہ ان کو اپنے پاس

سے بھگادوں؟اوران کو کہہ دوں کہ چونکہ تم بڑے بڑے منصبوں اور عہدوں پر فائز نہیں ہو، اس لئے اللہ کے نزدیک بھی تمہارا کوئی مرتبہ نہیں۔ میں تو اللہ کا پیغمبر ہوں اور مجبور ہوں، کہ یکساں طور پر اللہ کا پیغام سب کو پہنچادوں۔

دنیا کے ان حریص بندوں نے جب مساوات کا وعظ سُنا تو بے تاب ہوگئے۔کہنے لگے کہ ہم ایسی تبلیغ واشاعت کونہیں چلنے دیں گے، اگر آپ نے چند دن اور ان مشاغل کو جاری رکھا تو سنگسار کردیئے جاؤگے۔

قوم عاد پر مادیت پرستی کا غلبہ اور اس کی تباہی

انسانی فطرت کا عام قانون ہے۔ کہ جب انسان کو مال ودولت سے بہرہ وافر قرار دیا جائے اور اس کی اہلیت سے زیادہ اس کونوازا جائے تو پھر یہ آپے سے باہر ہوجاتا ہے۔ اور اس میں تفاخر وتکبر کے جذبے، دنیا کو دائمی اور ابدی سمجھنے کا تخیل اور تفرد واختصاص کے ولولے پیدا ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تو قوم عاد کی بالکل یہی کیفیت تھی۔ مال ودولت کی فراوانی کی وجہ سے ان کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ یہ ہر بلندی پر عیش وعشرت کے قصر تعمیر کرتے، تاکہ یہ ان کی عزت اور وقعت کے نشان قرار پائیں۔ اور وہ بڑے بڑے قلعے بناتے، تاکہ نفس کو یہ فریب دے سکیں کہ یہ مقام عارضی وفانی نہیں، بلکہ آفات وبلیات سے ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رہنے والا ہے۔ اور اختصاص وتفرد کے لئے عام لوگوں پر سختی کرتے اور یہ چاہتے کہ تمام راحتیں اور آرام ان کی قوم سے مختص ہوجائیں۔

حضرت ہود نے ان کی اس مادیت پرستی کو دور کرنے کے لئے تقویٰ کا نسخہ تجویز فرمایا اور ان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں اللہ کا رسولؑ ہوں اور تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں! کیونکہ معاوضہ طلب کرنے کی صورت میں تبلیغ بالکل بے اثر ہوجاتی ہے۔

یہ واضح رہے، کہ پیغمبر دنیا والوں سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ اور نبوت کو جلب منفعت کا ذریعہ نہیں بناتا۔

حضرت ہودؑ نے جب قوم سے کہا کہ مادیت پرستی میں اس قدر غلو کرنا تمہاری ہلاکت کا باعث ہوگا تو وہ ہنسے اور کہا کہ جناب آپ کے وعظ کا ہمارے دلوں پر قطعًا کوئی اثر نہیں، ہم تو عیش وعشرت کی زندگی کو ایک معمول اور ناگریز بات جانتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بہت بڑا جُرم نہیں۔ پہلی قوموں میں بھی اس نوع کے جذبات موجود تھے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم عذاب الٰہی سے ڈریں۔ اور خائف ہوں۔

قوم کے اس متکبرانہ جواب پر حضرت ہود بالکل مایوس ہوگئے۔ تب اللہ کی غیرت جوش میں آئی اور ان کی اُلٹ دی گئیں۔ اور تفاخر وتکبر کے علم سرنگوں کردیئے گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عاد کی تمام شان وشوکت خاک میں مِل گئی اور نشہ دولت وقوت کے سرشار فنا کی آغوش جا سوئے۔

قوم ہودؑ کی سرکشی اور ہلاکت

جس طرح کفر وانکار کی ماہیت یکساں ہے، اسی طرح ایمان وایقان کی حقیقت ایک ہے، جس طرح آدمؑ نے توحید کی اولین شمع روشن کی، اسی طرح انبیا مابعد نے تفرید کا اُجالا پیش کیا۔

چنانچہ آپ انبیا کی تعلیم میں ایک نوع کی وحدت دیکھیں گے۔ اور محسوس کریں گے کہ ان لوگوں کا منبع ایک ہے۔ ماخذ ایک ہے۔ تعلیم ایک ہے۔ اور پیغام ایک ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ صداقت ہمیشہ حقیقت ہوتی ہے۔

حضرت ہودؑ نے قوم کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دی تھی۔ اسی طرح حضرت صالحؑ نے فرمایا کہ دل میں تبدیلی پیدا کرو قلب سے دنیا کی محبت نکال دو ۔ اور اس کو معارف ایمان سے معمور کردو۔ اور اتنا پاکیزہ بناؤ کہ گناہ اس میں اپنا نشیمن نہ بناسکے، میں تم سے معاوضہ نہیں چاہتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہیں دنیا کے عیش وعشرت کے سامان سے ہمیشہ یونہی بہرہ ور ہونے کا موقع دیا جائے گا اور تم کو چشموں اور باغوں میں اور کھیتوں اور درختوں میں بلا کسی باز پرس کے محوِ نشاط رکھا جائے گا، ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ کے قانون مکافات کی تشریح اور ارتکاذات عمل غافل مشو کی تلقین کی جائے۔

وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً فَارِهِيْنَ . سے غرض یہ ہے کہ تم نے نشاط اور تفریح کے لئے پہاڑوں میں اپنے مکانات بنائے ہیں۔ اگر روح کی نشاط کے لئے بھی تم نے کچھ سوچا ہے؟ ارشاد ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت اختیار کرو۔

وَلَا تُطِيْعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ . سے مُراد یہ ہے کہ نافرمانوں کا کہا نہ مانو۔ اسراف، قرآن کی اصطلاح میں حدود اعتدال سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ اور مسرف وہ لوگ ہیں جو حدود شریعت کو ملحفوظ نہیں رکھتے۔ اور خواہشاتِ نفس کے پیرو ہیں۔

حضرت لُوطؑ کا اخلاقی مشن

حضرت لوطؑ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے اور ایک خاص اخلاقی مشن کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے تھے، ان کا اخلاقی نصب العین یہ تھا کہ سَدومیوں کے جذبۂ ناپاک کی اصلاح کی جائے۔ اور ان کے غیر فطری رجحانات کو فطرت کے صحیح اور پاکیزہ راستے کی جانب منتقل کر دیا جائے، بات یہ تھی کہ سدومی ہوس اور شہوت کے مجسم پیکر تھے، ان کے دلوں سے مذہب کا احترام اُٹھ چکا تھا۔

روحانیت بالکل مفقود تھی اور گو وہ بظاہر انسان تھے، مگر جذبات وخیالات کے اعتبار سے بالکل حیوان تھے، وہ زندگی کو محض وسیلۂ عیش وعشرت سمجھتے۔ اور ہر وقت معصیت میں مبتلا رہتے۔ حضرت لوطؑ نے اس صورت حالات کو دیکھا۔ اور ان کو اس فعل شنیع سے روکا۔ فرمایا کمبختو! اللہ نے تمہاری جنسی ضروریات کی تکمیل کے لئے عورتوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کہ تم ان کو چھوڑ کر لونڈوں کے پیچھے بھاگے پھرتے ہو۔ آخر اس تجاوز اور غیر طبعی مشاغل سے تمہارا مقصد کیا ہے، میں تمہاری اِن حرکات کو قابل نفرت سمجھتا ہوں۔ اور تمہارے اعمال کا سخت مخالف ہوں۔ اُن بدبختوں نے بجائے اس کے کہ اس گناہ سے باز آتے اور توبہ کرتے، حضرت لوطؑ کی نصیحتوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا۔ کہ اگر آپ نے وعظ ونصیحت کے اس سلسلہ کو بند نہ کیا تو ہم آپ کو اس بستی سے نکال باہر کریں گے۔

حضرت لوطؑ نے اللہ سے پناہ مانگی اور دعا کی کہ اللہ، مجھے اور میرے گھر والوں کو ان ظالموں سے مخلصی عطا فرما اور ان کی بداعمالیوں کے وبال سے نجات دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں پر پتھروں کی سخت بارش ہوئی۔ اور یہ ہمیشہ کے لئے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔

بداخلاقی کا قوم کی تباہی کا باعث ہونا

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بداخلاقی بھی کسی قوم کی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوسکتی ہے، بلکہ اخلاق دشمنی کی اصلاح اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس درجہ اہم ہے کہ اسکے لئے ایک خاص پیغمبر مبعوث اور مامور کیا گیا۔

کیا مسلمانوں نے کبھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن واقعات کو کیوں بیان فرماتے ہیں، آخر لوطؑ کی قوم کے غیر فطری رجحانات ہمارے لئے کیوں قابل تشریح ہیں، کیوں ان کے اس گندے مذاق کی تشہیر ضروری سمجھی گئی، بلکہ کئی دفعہ اس کو بیان فرمایا؟

اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک وقت آئے گا، جب کہ مسلمانوں میں بھی یہ مرض پھیلے گا اور وہ جذبات وخیالات کے لحاظ سے بالکل سدومیوں کے ہم مرتبہ ہوں گے اور اُن کی طرح پاکبازی کو نفرت کے قابل سمجھیں گے۔ موجودہ تہذیب اور کلچر کی وجہ سے قوم کے بیشمار بچے اس ابتلائے عظیم میں مبتلا ہیں، نسلیں کمزور ہورہی ہیں۔ حوصلہ اور جسارت کے ولولے تقریباً ختم ہیں۔ کیا علمائے قائدین اس مرض کے ازالہ کے لئے حضرت لوطؑ سے سبق لیں گے! اور آیندہ نسلوں کو ہلاکت وتباہی کے عذاب سے نجات دلائینگے۔

اصحاب ایکہ کی بدمعاملگی کی وجہ سے اُن پر عذاب

معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب ایکہ بادیہ پیالوگ تھے۔ اور ان کا کوئی مستقل مسکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اصحاب ایکہ سے موسوم کیا گیا، ایکہ کے معنے درختوں کے اجتماع اور جھنڈ کے ہوتے ہیں۔

دوسرے قصوں اور اس میں ایک بات امتیاز کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن سب قصوں میں پیغمبروں کو ان کی قوم کا بھائی قرار دیا گیا ہے، جیسے اخوھم نوح۔ اخوھم ھود۔ اخوھم صالح۔ اخوھم لوط۔ مگر اس قصے میں کہا گیا ہے۔ **إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ** جس کی وجہ مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت شعیبؑ قومیت کے اعتبار سے ان لوگوں میں سے نہیں تھے، مگر اس سے زیادہ موزوں اور دقیق وجہ یہ ہے کہ اصل میں انبیاء کو اخوان قوم باعتبار قومیت کے نہیں کہا گیا، بلکہ باعتبار اُس شفقت اور محبت کے کہا گیا ہے، جو انبیاء کو اپنی اُمّت کے ساتھ ہوتی ہے اور اس میں یہ حکمت بھی پنہاں ہے کہ لوگ باوجود انتہائی عقیدت اور منزلت کے ان کو دائرہ بشریت کے اندر سمجھیں اور ان کے مرتبے کو حد سے زیادہ نہ بڑھائیں۔

حضرت شعیبؑ کے لئے اخ کا لفظ غالباً اس لئے استعمال نہیں فرمایا، تاکہ شعیبؑ کی قوم کے متعلق معلوم ہو کہ ان کی بدمعاملگی کی وجہ سے ان کا رشتۂ اخوت ان سے منقطع ہے۔ اور جب تک یہ لوگ معاملات میں دیانت دار نہ ہوں گے، اخوت ان میں قائم نہ ہو سکے گی اور یہ برابر منتشر اور متفرق افراد کی صورت میں رہیں گے۔

اس لفظ کے یہاں ترک کردینے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر جُرم بدمعاملگی کے جرم

سے نسبتاً ہلکا ہے۔

پیغمبر کا رشتہ نبوت منقطع نہیں ہوا کرتا، مگر بدمعاملگی کی صورت میں پیغمبر کسی قوم سے کسی قسم کا ناطہ نہیں رکھتے۔

بات یہ تھی کہ اصحاب ایکہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ جنگلوں میں پھر کر تجارت کرتے اور اپنا وقت گذارتے، مگر ان میں یہ بُرائی پیدا ہوگئی تھی۔ ماپ تول میں بددیانتی کرنے لگے۔ اور اس طرح نظام تمدن سے دشمنی کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیبؑ کو انکی اصلاح کیلئے مبعوث فرمایا، تاکہ انکو اس حقیقت کی جانب توجہ دی جائے کہ رشتۂ انسانیت کو استوار کرنے کیلئے دیانتداری شرطِ اوّل ہے۔ اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ تجارت کے لئے خواہ مخواہ بے ایمانی کی جائے۔ غیرمتدین اشخاص نے یہ بات غلط طور پر مشہور کردی ہے۔ کہ تجارت اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں دیانت وامانت دونوں چیزیں تجارت کو فروغ دینے کیلئے بمنزلہ راس المال کے ہیں۔

اسلئے جو قوم معاملات اور لین دین میں حدود اخلاق کو ملحوظ نہیں رکھتی، کبھی سچی اور حقیقی کامیابی حاصل نہیں کرسکتی۔ جھوٹ سے تجارت کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ عارضی طور پر کوئی شخص بھی کسی کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوجائے، مگر ہمیشہ لوگوں کو دھوکے میں رکھنا ناممکن ہے۔ حضرت شعیبؑ نے جب اُن سے کہا کہ ماپ تول میں دیانتداری سے کام لو، کیونکہ صحیح تمدن کا یہی تقاضا ہے تو انہوں نے اس صاف گوئی کو ناگواری کیساتھ سُنا۔ اور انکار کردیا، نتیجہ وہی ہوا، جو سنت اللہ کے مطابق عذاب میں مبتلا ہوگئے اور مٹ گئے۔

قرآن کے بارے میں حقائق

قصص واخبار کا ذکر کرکے یہ بتایا کہ یہ وہ کتاب ہے۔ جو اقوام وملل کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور جس میں زندگی کے ہر شعبہ پر کما حقہ بحث ہے، جو انتہا درجے کی فصاحت وبلاغت سے متصف ہے اور جو تعلیمات اور پیغام کے لحاظ سے کائنات کی جامع ترین کتاب ہے۔ اللہ کا پیغام ہے، جو عام مادی وروحانی سب کا یکساں رب ہے۔ اُس کو روح الامین یعنی جبرائیل لاتے ہیں، جبریل الامین، اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں اور تبلیغ احکام پر مقرر ہیں، آپکے قلب پر اللہ کی جانب سے تعلیم کا نزول ہوتا ہے۔ وہ اللہ سے آیات سُن کر آپؐ کے دل تک پہنچا دیتے ہیں یہ کتاب عربی زبان میں نازل کی گئی ہے۔ یعنی ایک ایسی زبان میں روحانی مطالب کو ادا کرنے کے لئے بہت زیادہ موزون ہے۔ اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اسی کو آتشین شریعت کہا گیا ہے۔ اس کی آمد آمد کے ترانے گائے گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاران کی چوٹیوں سے ایک نور چمکنے والا ہے اور ایک سردار آنے والا ہے۔ ایک سُرخ وسپید انسان کے آنے کی پیشگوئی ہے۔ اور یہ وضاحت مذکور ہے کہ دنیا میں ایک نیا یروشلم آباد ہونے والا ہے۔ اس بات کا بھی ذکر ہے کہ نئے نئے ممالک اس صاحب شریعت کی راہ تکیں گے۔ اور ساری دنیا اس کے نغموں سے گونج اُٹھے گی۔

ارشاد ہے کہ ان حقائق سے بنی اسرائیل کے علماء آگاہ ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ سب باتیں صحیح اور درست ہیں۔

فرمایا ہے کہ عربی میں قرآن کو نازل کرنے کی یہ مصلحت تھی کہ مطالب کو زیادہ وضاحت کے ساتھ اس میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسری زبانیں ادائے مطالب کے حق میں اس کی ہمسری نہیں کرسکتیں۔ تاہم اگر اس کو کسی دوسری زبان میں ہم نازل کرتے تو یہ لوگ بہر آئنہ منکر رہتے۔ کیونکہ ان کے دل ودماغ کی حالت کچھ اس نوع کی ہے کہ پذیرائی حق کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتے۔ ان کی طبیعتیں مسخ ہوچکی ہیں اور رشد وہدایت کی استعداد چھن چکی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ یہ لوگ عذاب الیم کے منتظر ہیں اور جب تک یہ عذاب نہ آئے گا یہ لوگ سچائی اور حق کا اعتراف نہ کریں گے۔

قرآن حکیم کے متعلق یہ کہنا کہ انسانی کام ہے۔ سراپا ناواقفیت اور جہالت پر دال ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان جو زیادہ تعلیم یافتہ ماحول میں پیدا نہیں ہوتا، جو کسی کے سامنے زانو کے تلمذ تہ نہیں کرتا، جس کے حالات عادی اور معمولی نہیں۔ وہ یکا یک حکمت وفلسفہ اُگلنے لگے اور اقوام وملل کے فلسفہ موت وحیات پر مبصرانہ فیصلے فرمانے لگے۔

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی کتاب انسانی دماغ کا نتیجہ ہو۔ جو فصیح وبلیغ بھی ہے، آسان بھی ہے اور تمام انسانی ضروریات وداعیات کو پورا کرنے والی بھی ہے۔

سورۂ نمل

سورۃ نمل کا آغاز قرآن کے تعارف سے ہوا ہے۔ ارشاد ہے کہ یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔ قرآن کے معنی اس کتاب کے ہیں، جسکی کثرت سے قرأت اور تلاوت ہو۔ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے۔

غور فرمایئے، انجیل کی اشاعت آج دنیا میں سب کتابوں سے زیادہ ہے، دنیا کے ہر گوشے میں مشینری موجود ہیں اور ہر وہ زبان اور ہر قوم میں اس کو سرعت سے پھیلا رہے ہیں، مگر وہ کتاب جس کی دن رات تلاوت ہوتی ہے، صرف قرآن ہے، کتاب مبین سے غرض یہ ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں تمام ضرویات انسانی کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، اسمیں کہیں بھی ابہام نہیں ہے۔ ہر قسم کی فرد گذاشت اور اغلاط سے پاک ہے۔ ہر شخص کے لئے موقع ہے۔ کہ وہ اسکے انوار سے کسب ہوسکے، ارشاد ہے کہ قرآن اور کتاب مبین ان لوگوں کی راہ نمائی کیلئے ہے، جو ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔ اور نماز اور زکوٰۃ کے پابند ہیں! آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ایمان بالآخرت کے متعلق فرمایا کہ اسکے بغیر دلوں میں خلوص اور نیکی کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہی عقیدہ ہے، جو اعمال کو درست کردیتا ہے اور ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ اسی عقیدہ کی وجہ سے نیکی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کے طفیل انسان تمام بُرائیوں سے حقیقی طور پر نفرت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر عمل کی ذمہ داری سے اور محاسبہ طلب ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ایک وقت آئیگا، جبکہ سب لوگوں کو خدا کے حضور میں اکٹھا ہونا پڑیگا اور وہاں یقیناً اعمال کی سخت باز پرس ہوگی، قرآن حکیم کہتا ہے جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ نتائج کے لحاظ سے سخت گھاٹے میں رہیں گے، ان کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ دنیا میں خیر و برکت کا وافر ذخیرہ جمع کرسکیں اور اپنے لئے زاد راہ کا سامان کرسکیں، یعنی قرآن حکیم کو جو آپ حاصل کرتے ہیں تو اللہ کے حضور سے قریب ترین موقع ومقام سے۔ اس طرح کہ قلب سے تمام حجابات اٹھ جائیں اور انوار لاہوت اُس کو براہ راست حاصل ہوں۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کا کلام الٰہی ہونا بالکل قطعی اور یقینی ہے، اس میں کسی طرح بھی فریب نفس یا غلط فہمی کا دخل نہیں۔

حضرت سلیمانؑ نے تحائف واپس کردیئے!

اس آیت میں بلقیس نے عام بادشاہوں کی اور ملوک کی ذہنیت بیان کی ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ حدود مملکت کو وسیع کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اور جب کسی ملک کو فتح کرلیتے ہیں تو پھر بڑی ابتری مچاتے ہیں۔ وہاں کا نظام یک قلم بدل دیتے ہیں اور وہاں کے معززین اور اکابرین ان انقلابات میں پس جاتے ہیں۔ اس لئے یہ رائے تو درست نہیں کہ سلیمان کو یہاں آنے اور حملہ کرنیکا موقع دیا جائے۔ البتہ کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس نے وزراء سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ اُسکو یہاں کے تحفے تحائف بھیجے جائیں۔ اگر اُس نے ان کو قبول کرلیا تو معلوم ہوگا کہ وہ بہت زیادہ حریص نہیں ہے! اور ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اتنا پُرجوش ہوجائے گا اور اگر اُس نے انکار کردیا تو معلوم ہوگا کہ وہ جنگ پر آمادہ ہے۔

اس تجویز سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ سبا بہت عقل مند اور سمجھدار خاتون تھی، حالانکہ وزراء نے کہا تھا کہ ہم بہت بہادر ہیں اور ہر طرح مرنے مارنے پر تیار ہیں، مگر اس نے یہ مناسب خیال نہ کیا۔

غرضیکہ تحفے تحائف بھیجے گئے، لیکن حضرت سلیمانؑ نے انکو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ بلقیس کا خیال تھا کہ سلیمانؑ بھی دنیا کے عام بادشاہوں کی طرح ہوگا اور وہ ان تحائف کو دیکھ کر خوش ہوجائیگا۔ اس طرح دوسلطنتوں میں سیاسی تعلقات زیادہ استوار ہوجائیں گے۔ چونکہ حضرت سلیمانؑ جو بادشاہ کیساتھ پیغمبر بھی تھے، اسلئے طبعًا دنیا اور دنیا کے املاک سے بے نیاز تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ ملکہ سبا نے اسکے پیغام کو نہیں سمجھا اور انکو معمولی حریص اور دنیا دار بادشاہ خیال کیا تو غصہ میں آگئے اور کہنے لگے تحائف واپس بھیج دو ہم ان پر حملہ کرینگے اور ہماری فوجیں ان کو وہاں سے نکال باہر کریں گی اور انکو معلوم ہوجائیگا کہ ہمارے پاس دنیوی قوت بھی اُن سے کہیں زیادہ ہے۔

بات یہ تھی کہ حضرت سلیمانؑ کے مدنظر تبلیغ اسلام تھی، انہوں نے اسی لئے دعوتی خط بھیجا تھا، آپ چاہتے تھے کہ اس ملک کے لوگ اسلام کی دعوت کو قبول کرلیں! وہ بت پرستی چھوڑ دیں۔ آپکی خواہش تھی کہ یہ لوگ آفتاب کو خدا نہ سمجھیں، بلکہ اس خدا کے سامنے

جھکیں، جس نے آفتاب کو پیدا کیا ہے، مگر بلکہ سَبا نے اس دعوت پر قطعًا غور نہ کیا اور جس عنوان سے جوابدیا وہ توہین کے مترادف تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت سلیمانؑ کا مقصد جہاد سے محض حدود وسلطنت کو وسیع کرنا ہے اور مال ودولت کو حاصل کرنا ہے، اسلام کی اشاعت اور حق کو پھیلانا مدنظر نہیں۔ حالانکہ واقعہ اسکے برعکس تھا۔

بلقیس کا تخت اور علم الحرکت

حضرت سلیمانؑ کو ابتدا میں تو غصہ آیا کہ آخر کیوں بلقیس نے مجھ کو ایک معمولی قسم کا بادشاہ سمجھا۔ مگر ایک تدبیر ذہن میں آئی کہ لاؤ، یہ دیکھیں کہ وہ کہاں تک معاملہ فہم ہے۔ اسکا بہترین طریق یہ سمجھا گیا کہ بلقیس کو اپنے پاس بلائیں، چنانچہ پہلے تو انہوں نے اسکا تخت حکومت منگایا اور وہ بھی اس طرح کہ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ اعجاز دیکھ کر اللہ کی قدرتوں سے آگاہ ہوجائے اور اسلام قبول کرلے، پھر آپ نے درباریوں سے مخاطب ہوکر پوچھا کہ کون شخص ہے، جو بہت جلد ملکہ سبا کے تخت کو مجھ تک پہنچا سکتا ہے، ایک بہت بڑے پُرفن ہوشیار اور قوی جن نے کہا کہ حضور میں پہنچا سکتا ہوں اور اسقدر جلد کہ آپ اس مجلس سے اُٹھیں گے بھی نہیں اور تخت موجود پائیں گے۔ مگر ایک شخص جو اس سے بھی زیادہ ماہر تھا اور جس کو کتاب (الٰہی) کا علم تھا کہا کہ میں آنکھ جھپکنے سے پیشتر تخت کو آپکی خدمت میں حاضر کرسکتا ہوں۔ چنانچہ وہ گیا اور تخت حاضر ہوگیا۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ اس تخت کی ہیئت کو بدل دو، تاکہ یہ معلوم ہو کہ ملکۂ سبا کسقدر عقلمند ہے، چنانچہ تخت کی شکل بالکل تبدیل کر دی گئی اور ادھر اس اثنا میں ملکہ سبا پہنچ چکی تھی، وہ ان معجزات کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ جب حضرت سلیمانؑ نے پوچھا، کیا تخت آپکے سے ملتا جُلتا ہے۔ تو اُس نے کہا۔ ہاں کچھ اسی قسم کا اور اس کے بعد فوراً ہی اسلام کا اعتراف کرلیا۔ اور بول اُٹھی کہ میں واقع سے پہلے ہی آپ کی نبوت کو تسلیم کرچکی تھی اور مان چکی تھی کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کا شیش محل!

یہ دوسرا واقعہ ہے، جس سے بلقیس کو حضرت سلیمانؑ کی عظمت اور دانائی کا حال معلوم ہوا۔ اور جس کی وجہ سے وہ اس درجہ متاثر ہوئی کہ فوراً اسلام کا اعلان کردیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک عالیشان شیش محل تعمیر کرایا تھا اور اس کا صحن خصوصیت سے بلور کا بنوایا، جس کے نیچے پانی رواں تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے چمن میں پانی بہہ رہا ہے۔

بلقیس جب محل میں داخل ہونے لگی تو اس نے اپنے پائچے اٹھائے، جب یہ معلوم ہوا کہ پانی نہیں بلور ہے تو اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

بات یہ تھی کہ حضرت سلیمانؑ اصل میں یہ بتانا چاہتے تھے کہ آفتاب پرستی محض عقیدہ کا دھوکا اور فریب ہے اور اُسکو انہوں نے اسطرح ثابت کیا کے بلّور کے نیچے پانی رواں کرایا، تاکہ بلقیس کا ذہن فوراً اس حقیقت کی جانب منتقل ہو کہ جس طرح یہ بلور پانی نہیں ہے، بلکہ اس میں سے پانی نظر آتا ہے، اسی طرح آفتاب بھی تجلیات الٰہی کا مظہر ہے، بجائے خدا یا معبود نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ جس وقت اپنی غلطی کا احساس کرتی ہے تو فوراً اسلام قبول کرلیتی ہے اور اسکو معلوم ہوجاتا ہے کہ میرا سابق عقیدہ غلط تھا۔ آفتاب، پرستش کے لائق نہیں ہے، بلکہ پرستش کے لائق وہ ہے، جسکی روشنی کا یہ آئینہ دار ہے۔ ممکن یہ ہے عرش سے بھی کوئی اس قسم کا اشارہ مقصود ہو یعنی علاوہ عظمت واختیارات کے اظہار کے اس رمز کی جانب توجہ کو مبذول کرنا مطلوب ہو کہ جس طرح تمنے اپنے تبدیل شدہ تخت کو پہچان لیا ہے، اسی طرح دین فطرت کی طرف رجوع کرو۔ اور اس کی حقیقت کو پہنچانو، یہی وہ دین ہے، جسکو اللہ تعالیٰ نے کو ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے۔ ہاں اسکی موجودہ شکل یقیناً ہمارے تخت کی طرح بگڑ چکی ہے اور اب تمہارا اور تم جیسے عقلمند لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ انداز بیان تبلیغ کے لئے اس لئے اختیار فرمایا کہ اُس زمانے کے لوگ حکمت ودانائی اور رمز واشارات کی باتوں کو زیادہ استعمال کرتے تھے۔

سُدومیت کیخلاف جہاد کی ضرورت

اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات یا قانون عذاب انہیں لوگوں پر عادی ہوتا ہے جو اُس پیغام سے روگردان ہیں۔ اور اپنے گناہوں پر اصرار کرتے ہیں۔

حضرت لوطؑ، قوم سدوم کی طرف آئے اور وہ دنیا کی بدترین قوم تھی۔ سب سے

پہلے انہیں لوگوں نے خلاف وضع فطری فعل ایجاد کیا اور اس میں اس درجہ غلو اختیار کیا کہ یہ بدعملی ان میں عام رائج ہوگئی۔ حضرت لوطؑ نے کہا کہ یہ بہت بے حیائی کا کام ہے۔ تمہیں اپنی ان حرکات پر شرمانا چاہئے اور اپنی اس جہالت کا احساس ہونا چاہئے، کہ مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہو تو انہوں نے بہت ناگواری کے ساتھ ان نصیحتوں کو سُنا اور کہا کہ لوط اور اس کے ماننے والوں کو بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بڑی پاکبازی کا اظہار کرتے ہیں اور اس لائق نہیں ہیں کہ ہمارے ساتھ رہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اصرار گناہ اور انتہائی بداخلاقی کے باعث اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور یہ لوگ شدید عذاب میں مبتلا ہوگئے۔

افسوس ہے کہ آج کل بھی تقریباً یہی حالات رونما ہیں۔ لوگوں میں یہ مرض سُرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے اور نوجوان اس بڑے افعال سے قطعاً شرم اور ندامت محسوس نہیں کرتے۔ اور اب ان کے روزمرہ میں یہ چیز داخل ہوگئی ہے کہ وہ پاکباز نوجوانوں پر آوازے کَستے ہیں اور مختلف مذاق کو روشن خیالی سمجھتے ہیں یہ کس قدر شرم کا مقام ہے کہ جو بیماری قوموں کی ہلاکت وتباہی کا باعث ہے، آج ہم اُس بیماری پر فخر کررہے ہیں۔ ہماری مجلسوں میں، کالجوں اور مدرسوں میں، تربیت گاہوں اور مذہبی اداروں میں ہر وقت اس عمل بد کے چرچے رہتے ہیں۔ گویا فضا بالکل شہوانی ہوچکی ہے اور وقت آ گیا ہے کہ بدکاروں کی نسل دُنیا سے مِٹ جائے اور اس کی جگہ کوئی صالح اور نیک نسل لے۔ کیونکہ اس مرض سے ہمیشہ تباہی پھیلتی ہے اور گو آسمان سے پتھر کی بارش نہ ہو، مگر نسلیں ضرور بیکار کم حوصلہ اور بُزدل ہوجاتی ہیں۔ اور یہ عذاب پتھراؤ سے زیادہ شدید اور ہولناک ہے، کیونکہ اس میں تو یہ ہوتا ہے کہ قوم بالکل مِٹ جاتی ہے۔ اور اس کا وجود دوسروں کے لئے باعث اذیت نہیں ہوتا۔ اور اِس میں یہ ہوتا ہے کہ قوم بظاہر زندہ رہتی ہے، مگر روح اور عمل کے لحاظ سے بالکل مُردہ اور آیندہ آنیوالی نسلوں کیلئے مجسم عذاب اور مجسم ہراس وناامیدی، اسلئے ضرورت ہے کہ علماء اور اکابر ملت حضرت لوطؑ کی طرح میدان میں آئیں اور قوم میں اخلاق کی اصلاح کے لئے ٹھوس کام کریں۔ اور اس سے ہرگز نہ شرمائیں کہ یہ کس نوع کا کام ہوگا، جب ایک پیغمبر، خاص اس مشن کی تکمیل کیلئے آ سکتا ہے تو پھر اس سنت پر عمل کرنے سے علماء اور اکابر کیوں شرمائیں۔

معبودِ حقیقی کون ہے؟

یہاں سے بیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ یہاں سے کسی نئے مضمون کا آغاز ہو، کیونکہ پاروں کی تقسیم مضامین کے اعتبار سے نہیں ہے۔

اس سے قبل کی آیت میں سوال کیا گیا تھا کہ **آللّٰهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُونَ**. یعنی ان گذشتہ واقعات کو دیکھو، اقوام وملل کی تاریخ کو پڑھو اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عذاب سے بچایا اور کیونکر مخالفین کو عبرتناک سزائیں دیں، اسکے بعد یہ فیصلہ کرو کہ عزیز وغالب خدا بہتر ہے یا وہ جو تمہارے بے جان بُت ہیں۔ اور جن میں نفع وضرر کی کوئی استعداد موجود نہیں۔

اِن آیات میں قرآن نے نہایت بلیغ اور دلنشین انداز میں مناظر قدرت کی جانب انسان کی توجہ کو مبذول کیا ہے اور دریافت کیا ہے کہ جمال وکمال کے ان مشاہدات کے بعد تمہاری رائے کیا ہے، کیا تم اس خدا کو ماننے کے لئے آمادہ ہو۔ جس کی حکمت سے کائنات زندہ اور قائم ہے۔ یا ان کو جن کا دنیا میں کوئی حصہ نہیں اور وہ محض بیکار اور مہمل ہیں۔

قرآن حکیم کا یہ مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ انسان کے دِل میں مواہب وجدان کو بیدار کردیتا ہے۔ اور اس کے دل ودماغ پر قطعی دلائل وبراہین کا بوجھ نہیں ڈالتا، وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان ذاتی مطالعہ سے ان نتائج تک پہنچے، جن کو وہ پیش کرتا ہے اور براہِ راست ان معارف اور معلومات سے جو فطرت کے حُسن وجمال سے حاصل ہوں، توحید وتجرید تک رسائی حاصل کرلے۔ جن کو بار بار بیان کیا جاتا ہے، قرآن کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ لوگ خود بخود سوچ سمجھ کر اسکے ہمنوا ہوں۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ بتاؤ کہ الوہیت اور خدائی کے لئے وہ ذات زیادہ موزوں ہے، جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، جس نے آسمان کی بلندیوں سے تمہارے لئے پانی نازل کیا۔ اور نہایت عمدہ عمدہ باغ پیدا کئے، جن کو تم سرسبز وشاداب نہیں کر سکتے تھے۔ یا وہ خود اصنام خیالی، جو تم نے بنا رکھے ہیں، کہو وہ عقیدت اور نیازمندی کے لئے سزاوار ولائق ہے، جس نے زمین کو جائے قرار بنایا۔ اسمیں نہریں رواں کیل اور اسکے استقرار کیلئے

پہاڑ پیدا کئے اور دو دریاؤں میں بکمال حکمت ایک قسم کی آڑ بنادی تا کہ آپس میں مختلط نہ ہونے پائیں۔ ان میں ایک میٹھا ہے اور دوسرا کھاری یا تمہارے معبودانِ باطل۔ قرآن پوچھتا ہے کہ آیا وہ ذاتِ رحمت آیات، عبادت اور بندگی کے لئے بہتر ہے۔ جو بے قرار اور بے چین انسان کی دُعاؤں کو سُنتا ہے اور جس نے تمہیں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے یا وہ ذات جسکو تم اپنے رُعم میں خدا سمجھتے ہو۔ فرماتے ہیں۔ کہ سمندر اور جنگل کی تاریکوں میں تمہاری کون رہنمائی کرتا ہے۔ دُعاؤں کو سُنتا ہے اور جس نے تمہیں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے یا وہ ذات جسکو تم اپنے رعم میں خدا سمجھتے ہو۔ فرماتے ہیں۔ کہ سمندر اور جنگل کی تاریکیوں میں تمہاری کون راہ نمائی کرتا ہے۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت ناک ہواؤں کو بارانِ رحمت سے پہلے کون بھیجتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ان واقعات پر مبصرانہ نظر دوراؤ۔ اور پھر دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھو کہ ان میں توحید کے چشمے بہتے ہیں۔ یا شرک سایۂ افگن ہے۔

توحید یا دہریّت

یہ آیات توحید کا بقیہ حصہ ہیں، اس میں وہی سوال چلا آ رہا ہے کہ بتاؤ۔ خالق اور رازق اللہ عبادت اور بندگی کا مستحق ہے یا تمہارے مقرر کردہ معبود۔ **قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ.** سے مراد ہے کہ شرک کے جواز کے لئے کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور کسی دلیل سے یہ نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ رب العزت کا کوئی شریک بھی ہے۔ کیونکہ عقل وبصیرت کیلئے صرف دو۔راہیں ہیں، جن کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایک توحید کی راہ یعنی اللہ ایک ہے، وہ بے مثل ہے اور بے نظیر ذات ہے اور اسکے تخیل میں کثرت اور تعدد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُس کا نفس تصور ہی شرکت اور کثرت کو مانع ہے۔ دوسری راہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس ذاتِ بے ہمتا کو مانا جائے۔ اور دنیا کو محض مادہ کے مختلف مظاہر سے تعبیر کیا جائے۔

چونکہ موخر الذکر سوال مشاہدہ کے سراسر خلاف ہے، دُنیا کا سارا نظم ونسق اور اس کا حسن وجمال ایک شاہد حسین کا پتہ دے رہا ہے، اور بتا رہا ہے کہ کوئی معشوق ہے، اس پردہ نگاری میں۔

اکثر غیب کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کے جاننے کو غیب کہتے ہیں، جنکا پیشتر سے علم نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں کے اعتبار سے ہر شخص عالم الغیب ہے۔ کیونکہ ہر شخص کچھ نہ کچھ ایسی باتیں معلوم کر لیتا ہے۔ جس کا پیشتر سے اسکو علم نہیں ہوتا اور اس طرح اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایجادات واختراعات کیا ہیں۔ یا یہ پیشتر سے انسانوں کو معلوم تھیں، اور اگر معلوم نہیں تھیں تو کیا ان جیسی آگاہی علم غیب ہے اور اگر اس نوع کی معلومات علم غیب کی تعریف میں آ سکتی ہیں تو پھر صرف اللہ کے عالم الغیب ہونے کے کیا معنی ہیں، یہ سوالات ہیں، جو قدرتاً غیب کی صحیح تعریف نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

بات اصل میں یہ ہے، کہ غیب کے معنی مطلقاً کسی چیز کو اس طرح جاننے کے ہیں کہ استدلال اور استنباط کی درمیانی کڑیاں مفقود ہوں۔ یعنی اس چیز کو معلوم کرنے کا کوئی منطقی اور طبعی ذریعہ نہ ہو اور باوجود اسکے یقین کے ساتھ اس کا پتہ دیا جائے۔ اس قسم کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو بلا کسی توسط کے بطور خود جانتا ہے اور اس کو کسی استدلال اور استنباط کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ انسان کا علم اکتسابی ہے اسلئے وہ علوم غیب پر مطلع نہیں ہوسکتا۔

دابتہ الارض

جو لوگ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ مانتے ہیں۔ کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ عالم کون ، عالم فساد سے بدل جائے گا۔ چاند اور ستارے بے نور ہوجائیں گے۔ آفتاب اپنی حرارت کھودے گا اور یہ بزمِ آراستہ منتشر ہوجائے گی۔

جو لوگ اتنی بڑی خرق پر ایمان رکھتے ہیں کہ آسمان کی بلندیاں اور زمین کی وسعت یہ سب چیزیں فنا ہوجائیں گی اور صرف ایک اللہ کی ذات باقی رہ جائے گی۔

جن لوگوں کو اس بات کے مان لینے میں کوئی تامل نہیں کہ یہاں کا ذرہ ذرہ خوارق وعجائب کا مجموعہ ہے۔ ان کے لئے دابتہ الارض کا وجود قطعاً حیرت واستعجاب کا موجب نہیں ہوسکتا۔ اور وہ بالکل اس فوق العقل چیز کا انکار نہیں کر سکتے۔

وہ بجائے خود اللہ کی ہستی اور قیامت کی حقانیت پر بہت بڑی دلیل ہوگا۔ ظاہر ہے

کہ یہ علامات قیامت میں سے ہے، اس لئے زیادہ تفصیلات کی ضرورت نہیں۔ بس اس قدر جان لینا کافی ہے۔

قصّہ غلامی وآزادی

سورہ قصص کی ابتدا موسیٰؑ اور فرعون کے قصے سے ہوتی ہے کیونکہ یہ قصہ اپنے اندر مظلوموں اور بیکسوں کے لئے ایک عجیب کشش رکھتا ہے، اس کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ مکے کے زبردست انسانوں کے دل میں اُبھار اور بلندی کی خواہشات پیدا کی جائیں۔ اور انہیں بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیونکر مدد کرتا ہے اور کس طرح خصیص غلامی سے اُٹھا کر حکومت ووراثت کے بلند مقام تک پہنچا دیتا ہے۔

یہ قِصّہ حقیقت میں فرعون اور موسیٰ کا قصہ ہی نہیں، بلکہ حق وباطل کی معرکہ آرائی کا مکمل نقشہ ہے۔ فرعون اور فرعون جیسے ظالموں کی داستان عبرت ہے بلکہ یوں کہیئے کہ آزادی اور غلامی کا کامل فوٹو ہے۔

اس میں وہ تمام داؤ پیچ بیان کئے گئے ہیں، جو مظالم اور برسراقتدار قومیں غلامی کی زنجیروں کو مستحکم کرنے کے لئے اختیار کرتی ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو ہمیشہ کے لئے ذلیل اور غلام رکھنے کے لئے دو تجویزوں کو پسند کیا، ایک یہ کہ ان میں افتراق وتشتت کے جذبات پیدا کردیئے۔ اور وحدت ویکسانی کی مخالفت کی جائے۔ دوسرے یہ کہ لڑکوں کو ذبح کر ڈالا جائے۔ اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس غلامانہ زندگی پر قانع رہیں۔

بتایئے کہ کیا آج کا فرعون اُس فرعون سے زیادہ دانائی سے انہیں دو طریقوں کو استعمال نہیں کر رہا؟ یہ لڑائی اور ہنگامے، یہ اختلافات کے طوفان اور جھگڑ، جماعت بندیاں اور گروہ سازیاں، کیا محض اس لئے نہیں پیدا کی جارہی ہیں۔

اس طریق سے آزادی اور حریت کے جذبات کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور قوم اپنے اختلافات میں اُلجھ کر اپنے غالب دشمن سے غافل ہوجاتی ہے۔

یہ کالج اور یونیورسٹیاں، یہ مدارس اور تعلیم گاہیں۔ کیا مسلخ اور مذبحوں سے کم ہیں۔ جہاں لاکھوں نوجوانوں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ عورتوں میں آوارگی اور فیشن کی ترویج کیا موجودہ تعلیمات کا نتیجہ نہیں ہے۔ بہرحال فرعون ہمیشہ ایک رہتا ہے، صرف ظلم وستم کا انداز ذرا بدل جاتا ہے۔

ارشاد ہے کہ ایک طرف تو فرعون نے ان لوگوں کو ذلیل ٹھہرانے کی ٹھانی، اور دوسری طرف ہم نے ارادہ کر لیا کہ غریبوں اور کمزوروں کی مدد کریں گے۔ ان کو شرف وعزت کی نعمتوں سے نوازیں گے، انہیں لوگوں کے لئے نمونہ بنائیں گے۔ اور ارض مصر کی وراثت بخشیں گے! اور فرعون وہامان کو بتائیں گے کہ تمہاری کوششیں بار آور نہیں ہوسکتیں اور اب تم بنی اسرائیل کو زیادہ دیر غلام نہیں رکھ سکتے۔

اسکے بعد قصہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں کہ کیونکر ہم نے موسیٰ کو ان کی ماں کی گود سے اُٹھا کر فرعون کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اور پھر کیونکر ام موسیٰ کو موقع دیا کہ وہ مادرانہ جذبات محبت وشفقت کی تکمیل کرے۔

حضرت موسیٰؑ کی ماں نے جب فرعون کے ڈر سے اپنے بچہ کو دریا میں ڈال دیا تو وہ کسی طریق سے قصر شاہی میں پہنچ گیا۔ فرعون چاہتا تھا کہ اس بچہ کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ مگر بیوی نے روکا اور کہا، اسکو اپنا بیٹا بنائیں گے بڑا پیارا بچہ ہے۔ ممکن ہے یہ ہمارے لئے نفع وخیر کا باعث ہو، اس لئے اس کو نہ مارو۔

اللہ کی تدبیر دیکھئے کہ کیونکر فرعون کو لاولد رکھا۔ پھر کس طریق سے اسکی بیوی کے دل میں شفقت ومحبت کے جذبات پیدا کردیئے اور کس حکمت سے موسیٰ کو شاہانہ ٹھاٹھ دیکھنے کے مواقع بہم پہنچائے۔

غرض یہ تھی کہ جو شخص فرعون جیسے شاندار بادشاہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اُس کی تربیت اسی کے محل اور اُسی کی شاندار قصر میں ہو، تاکہ ابتدا ہی سے اُس کے حوصلے بلند ہوں۔ اور خیالات شاہانہ ہوں۔ وہ اس کے سازوسامان کو دیکھ کر مرعوب نہ ہوجائے۔ اور پوری خود داری، بے خوفی اور شانِ استغنا کے ساتھ بنی اسرائیل کی راہ نمائی کرسکے۔

ارشاد ہے کہ یہ سب کچھ فرعون کی تباہی کے لئے ہورہا تھا، وہ اتنا سمجھدار تھا، مگر ہماری تدبیر کی باریکیوں کو نہ سمجھ سکا، اس کے گھر میں اس کا دشمن جوان ہورہا تھا اور وہ اس سے بالکل بے خبر تھا۔ **وَهُمْ لاَ يَشْعُرُون۔**

موسیٰؑ مدین کے کنوئیں پر

موسیٰ علیہ السلام کے قبطی کو مارنے کے واقعہ سے مصر میں سنسنی پھیل گئی اور طبقہ امراء میں ہل چل مچ گئی، ان کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں یہی نوجوان بنی اسرائیل کی نجات کا باعث نہ ہو، اس لئے سب نے مِل کر مشورہ کیا کہ اس کو پکڑ کر مار ڈالو۔ حضرت موسیٰ کے مخلصین میں سے ایک آدمی تھا، وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور اُس نے حقیقتِ حال سے موسیٰ کو آگاہ کر دیا، اُس نے کہا کہ کہیں بھاگ جایئے۔ آپ کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام پریشان ہوئے اور مدین کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ان کو معلوم تھا کہ وہاں اُن کے عزیز واقارب رہتے ہیں۔ لیکن راستہ معلوم نہیں تھا، ڈرتے ڈرتے مصر سے نکلے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ مولا اس ظالم قوم سے مخلصی عطا فرمایئے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے ہیں، اس وقت نبوت سے باقاعدہ نہیں نوازے گئے تھے، مگر وجدانی طور پر بنی اسرائیل کی محبت ان کے دل میں ضرور جاگزین تھی۔ اور وہ قطعاً فرعون اور اس کی قوم کو ظالم خیال کرتے تھے۔

مشکلات کے وقت صرف اللہ سے مدد مانگنا

دوسری بات جو اس ہجرت سے مستفاد ہوتی ہے، یہ ہے کہ مصائب ومشکلات کے وقت صرف اللہ سے طلب اعانت کرنا چاہیئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ہجرت فرمائی تو آپ نے بھی کہا **إِنِّیْ ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ**. کہ میں اپنے رب کے لئے ہجرت کررہا ہوں۔ میری وہی راہ نمائی کرے گا اور حضرت موسیٰ اب جانے لگے ہیں تو بھی یہی فرماتے ہیں۔ **عَسَى رَبِّیْ أَن يَهْدِيَنِیْ سَوَاء السَّبِيْلِ**۔

جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ہر واقع میں جب انسان اپنے کو کسی الجھن میں دیکھے تو اللہ سے استعانت چاہے۔ اور فی الحقیقت جو لوگ اللہ کے سامنے جھکتے ہیں اور اس پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اسے اپنا کارساز اور وکیل سمجھتے ہیں، اللہ ان کو کبھی رُسوا نہیں کرتا۔ وہ ضرور ان کی آرزوں کو سنتا اور خواہشوں کو پورا کرتا ہے، اس کی نسبت یہی ہے کہ اس کو پکارو۔ وہ سُنے گا۔ اُس سے مانگو تو وہ ضرور دے گا اور اگر اس پر مستحکم ایمان نہ ہو، اس پر پورا بھروسہ اور توکل نہ ہو تو پھر وہ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اور اس حالت میں اس پر کوئی الزام بھی عائد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اللہ کو آزمانے کی ضرورت نہیں۔ وہ آزمائشوں سے قطعاً مبرا ہے۔

حضرت موسیٰ کی تربیت کا انتظام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے رحمت کا سامان مہیا کردیا۔ ایک لڑکی شرماتی، اور لجاتی ہوئی اُن کے پاس آئی۔ اور کہنے لگی، میرے ابا آپکو بُلاتے ہیں، تاکہ آپ نے ہمارے جانوروں کو پانی پلاکر جو احسان کیا ہے، اُسکا معاوضہ آپکو دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ بہنیں اپنے جانوروں کو پانی پلاکر پہنچی ہیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ کی ہمدردی کا تذکرہ اپنے والد حضرت شعیب سے کیا ہوگا اور اور حضرت شعیب نے اس بنا پر انہیں بُلالیا ہوگا۔

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں اگر حالات وفضا سے مجبور ہو کر کام کاج کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اجنبی عورت سے ہمدردانہ گفتگو میں کوئی گناہ نہیں، بلکہ بعض حالات میں ضروری ہوجاتا ہے کہ اس کمزور طبقہ کی مدد کی جائے۔

حضرت شعیب نے کہا تم یہاں رہو، سہو، یہ تمہارا گھر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دوبیٹیوں میں سے ایک بیٹی تمہارے نکاح میں دے دوں، مگر شرط یہ ہے کہ پورے آٹھ سال تک میری خدمت میں رہو اور اگر دس سال رہ جاؤ۔ تو یہ تمہاری مرضی ہوگی۔ میری طرف سے جبر نہ ہوگا۔ تم انشاء اللہ یہاں رہ کر محسوس کروگے کہ میں خوش معاملہ آدمی ہوں۔

حضرت موسیٰ نے بخوشی یہ شرط مان لی اور کہا کہ ان دونوں مدتوں میں سے جو چاہوں پُوری کردوں، آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بس یہ طے ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان اللہ گواہ ہے۔

یہ آٹھ سال کی خدمت اصل میں نکاح کے لئے شرط نہ تھی، بلکہ بات یہ تھی کہ حضرت شعیب علیہ السلام بذریعہ الہام جانتے تھے کہ موسیٰ آیندہ چل کر بڑے جلیل القدر

پیغمبر ہونے والے ہیں اور اب نوجوان ہیں۔ ان کو ثقہ اور متین ہونے کے لئے کڑی ٹریننگ کی ضرورت ہے، اس لئے انہوں نے اس حیلے سے ان کو اپنے ہاں رہنے پر مجبور کردیا کہ وہ ان کی صحبت اور فیوض سے اس قابل ہوجائیں کہ فرعون کا مقابلہ کرسکیں۔

کوہ طور پر اللہ کی تجلیات کا ظہور

حضرت شعیب کے گھر سے موسیٰ علیہ السلام جس وقت رخصت ہوئے ہیں، اس وقت ان کی بیوی اُن کے ساتھ تھیں، جنگل میں جارہے تھے، تاریکی اور سردی تھی۔ آگ کی ضرورت محسوس ہوئی، موسیٰ نے دور سے دیکھا کہ آگ کا شعلہ نظر آرہا ہے۔ بیوی سے کہا، میں نے آگ دیکھی ہے، ذرا دور ہے، میں جاتا ہوں۔ شاید آگ مِل جائے۔ اور کچھ پتہ لگے تم یہیں ٹھہرو ۔ یہ کہہ کر موسیٰ آگے بڑھے۔ دیکھا تو وہاں آگ نہ تھی۔ تجلیات الٰہیہ کا ظہور تھا۔

ارشاد ہوا، کہ موسیٰ میں تمہارا خدا ہوں۔ ساری کائنات کا رب ہوں۔ غرض یہ تھی کہ موسیٰ کو عہدہ نبوت پر سرفراز کیا جائے، ان کو معجزات عطا کئے جائیں اور بتایا جائے کہ اب تمہاری زندگی کا اصل دور شروع ہوتا ہے، یہ تجلی تو محض مخاطب کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔

تجلیات کی حقیقت تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے۔ مختصرا یوں سمجھ لیجئے۔ کہ جس طرح الفاظ معنی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح تجلیات، اللہ کے منشا کے اظہار کی تعبیرات ہیں۔ اور بس۔

ارشاد ہوا کہ یہ عصا جو تمہارے ہاتھ میں ہے، زمین پر ڈال دو اور جب موسیٰ نے اس حکم کے تعمیل کی تو دیکھا کہ لٹھ اژدہا بن گیا ہے اس پر وہ ڈرے۔ اور ڈر کر بھاگے۔ حکم ہوا۔ کہ ڈرتے کیوں ہو۔ واپس آجاؤ، تم بالکل محفوظ اور مامون ہو۔ دوسرا حکم ہوا کہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو اور پھر نکالو۔ اور دیکھو کہ کس قدر سفید براق ہوگیا ہے۔

یہ دو معجزے ہیں جو تمہیں دیئے گئے ہیں یا یوں سمجھو کہ کہ فرعون کے طلسم کبر وغرور کو توڑنے کے لئے دو بڑی بڑی دلیلیں ہیں، ان کو لے کر اس کے اور اس کی قوم کے پاس جاؤ کہ وہ فسق وفجور کو اپنا وتیرہ وخصلت بنا چکے ہیں، تم ان کی اصلاح کرو۔

ان دو معجزوں سے ایک تو یہ مقصود تھا کہ بے سروسامان موسیٰ کا دل مضبوط ہوجائے اور وہ معلوم کرلے کہ اللہ کی مدد میرے شامل حال ہے اور دوسری جانب فرعون اور اس کی قوم کو یہ محسوس ہو کہ جس طرح یہ خشک لکڑی اژدہا بن سکتی ہے اور گوشت پوست کا ہاتھ براق اور چمکیلا ہوسکتا ہے، اسی طرح بنی اسرائیل جیسی بے ضرر قوم ہمارے لئے خطرہ اور خوف ثابت ہوسکتی ہے۔ اور اس کا نصیب چمک سکتا ہے۔ اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتی ہے۔

عذاب الٰہی کب آتا ہے

مقصد یہ ہے کہ فرعونیوں پر اس وقت تک عذاب نہیں آیا، جب تک کہ انہوں نے کفر وعصیان میں غلو کا درجہ حاصل نہیں کرلیا، کیونکہ اللہ کا قانون ہے کہ معذبین کو مہلت دی جائے۔ ان کے اعمال سے تعرض نہ کیا جائے۔ اور کردار وعمل کے لئے پوری آزادی دی جائے، حتیٰ کہ دل سیاہ ہوجائے، طبیعت میں تاثیر وانفعال کی تمام قوتیں مفقود ہوجائیں اور گناہوں کا پیمانہ چھلک جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں لعنت سے مُراد اللہ کے فیوض وبرکات سے محرومی ہے اور اسکی رحمت سے دوری سب وشتم کے قسم کی کوئی چیز مُراد نہیں۔

ہدایت کا اللہ کے اختیار میں ہونا

اہل کتاب کے اس وفا شعار گروہ کے ساتھ ایک ایسی جماعت بھی تھی، جو قرآن کی روشنی سے دلوں کی ظلمتوں کو دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور حضور کی یہ انتہائی خواہش تھی کہ یہ لوگ بھی اسلام کی ضیاباریوں سے دماغوں کو منور کرلیں۔

قرآن نے کہا کہ آپؐ ہدایت کی جانب دعوت دے سکتے ہیں اور یہ کرسکتے ہیں کہ صبح وشام انہیں ان کے اعمال بد کے نتائج سے آگاہ کرتے رہیں، مگر توفیق ہدایت آپؐ کے بس کی بات نہیں۔ یہ آپؐ کے اختیار سے باہر ہے کہ جس کو چاہیں دائرہ فلاح وفوز میں شامل کرلیں اور اس کے سینے کو حق وصداقت کے لئے کھول دیں مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ جناب ابو طالب سے متعلق ہے کہ ہر چند حضورؐ نے ان سے کہا، چچا ایک دفعہ تو میرے سامنے توحید ورسالت کی گواہی دے دیجئے، مگر انہوں نے جانتے بُوجھتے یہی کہا کہ بھتیجے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اعیان قریش کی مخالفت کروں اور اسلام

قبول کر لوں، گویاباوجود اعتراف علم اور حضورؐ کی خواہش کے ابو طالب رشد وہدات کی برکتوں سے محروم رہ گئے، کیونکہ اللہ کی طرف سے توفیق واستعداد ارزانی نہیں ہوئی تھی اور اللہ کومنظور نہیں تھا کہ ابوطالب دنیا سے ایمان وایقان کی دولت لے کر جاتے۔

مادہ پرستی ودینداری کا موازنہ

اس آیت میں منکرین کے اس شبہ کا جواب ہے کہ اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو **نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا**. یعنی ہمیں ہماری سرزمین سے نکال باہر کیا جائے گااور املاک ودولت سب کچھ چھین لیا جائیگا۔

ارشاد ہے کہ کیا تم دولت عقبیٰ کا مقابلہ دنیائے دنی کے سامان عیش وعشرت سے کرتے ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ سب کچھ عارضی وفانی ہے۔ اور آخرت کی نعمتیں باقی رہنے والی اور دائمی ہیں اور منافع کے لحاظ سے کہیں بہتر اور موزون ہیں۔

فرمایا۔ پھر اس بات پر بھی غور کرو کہ دیندار اور دنیادار کیا اجر اور درجہ میں برابر ہیں؟ دیندار اور متقی کے لئے جنت کے پُر بہار دروازے کھلے ہوں گے اور دنیا کے طالب کو چند روزہ عیش کے بعد خدا کے حضور میں پکڑ کر لا کھڑا کیا جائے گا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ لوگوں کو عقبیٰ اور دینداری پر کامل یقین نہیں ہے،ورنہ حقیقت میں سچا دیندار انسان ہرگز دنیا میں ایک مادہ پرست سے کم خوش حال نہیں رہتا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مادہ پرستی میں قناعت نہیں ہے اور مسرت مفقود ہے اور دینداری میں طمانیت ہے،تسکین ہے اور مسرت وقناعت ہے۔

مادہ پرستی، حرص وآز کے جذبات کو بڑہا دیتی ہے، انفرادی خود غرضی پیدا کردیتی ہے۔ اور انسان کو بہائم کے قریب تر کردیتی ہے کہ وہ انہیں کی طرح بلند قسم کے مطمح نظر سے محروم ہوتا ہے۔

بخلاف اسکے دینداری ہمہ قناعت ہے،افراد کیلئے ایثار ومحبت ہے۔ اور انسانیت کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اسکی وجہ سے فرشتوں کا قرب اور عالم لاہوت سے وابستگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ فراز عرش سے متصل ہے! اور عالم اجساد سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔

مریدان باعقیدت کا مرشدوں سے بیزاری کا اظہار

یعنی آج تو مریدان باعقیدت اپنے مرشدوں پر بیحد بھروسہ رکھتے ہیں اور انہیں خدا کا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں،مگر قیامت کے دن معاملہ بالکل برعکس ہوگا، یہ عقیدت کیشان ازلی تو رہبران کامل کے پیچھے دوڑیں گے۔ اور پیران طریقت آگے آگے ان سے بیزاری کا اظہار کرینگے، مرید یہ کہیں گے کہ ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھااور وہ جواب دینگے غلط ہے، جس طرح ہم گمراہ ہوئے، اسی طرح یہ لوگ بھی بہک گئے اور حقیقت میں یہ محض ہوائے نفس کے تابع تھے، انہوں نے ہماری بالکل عبادت نہیں کی۔

اللہ جسکو چاہے اپنی خدمات کے لئے مختص کرلے

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ. سے مقصود اصل میں ایک شبہ کا ازالہ ہے۔ مکہ والوں کو ہمیشہ یہ بات کھٹکتی تھی۔ کہ خدا نے قریش کے بڑے بڑے لوگوں کو چھوڑ کر محمدﷺ، ایسے بے یارو مددگار شخص کو نبوت اور رسالت کیلئے کیوں منتخب کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم روساء ہیں۔معززین ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور دنیا کے لحاظ سے وجیہہ ہیں عظیم الشان ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کرکے آخر اللہ نے یہ کیا سوچا کہ ایک یتیم بینوا کو سرداری بخش دی؟ کیا ہم میں کوئی اس قابل نہ تھا۔ کہ اسکے سر پر نبوت کا تاج رکھا جاتا، کیا ہم سب نالائق تھے؟ انکی رائے میں یہ سخت تکلیف دہ اور ناقابل برداشت فروگذاشت تھی؟ عیسائی اور یہودی بھی تقریباً اس نوع کے اعتراضات کرتے، وہ بھی یہ کہتے کہ نبوت کے اعزاز کیلئے ابتک بنی اسرائیل کو اہل سمجھا گیا ہے۔ اور بنی اسماعیل کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ اسلئے ضروری تھا کہ اگر عرب میں کسی پیغمبر کو بھیجنا منظور تھا تو وہ بنی اسرائیل میں سے ہوتا، بنی اسماعیل میں سے نہ ہوتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم لوگ ہماری مصلحتوں سے آگاہ نہیں ہو، تمہاری نظریں بالکل سطحی ہیں تم یہ نہیں جان سکتے کہ کون شخص نبوت کے عہدۂ جلیلہ کے لئے مناسب اور موزون ہے۔تم صرف یہ دیکھتے ہوکہ تم میں کون زیادہ سرمایہ دار اور زیادہ اعوان وانصار رکھنے والا ہے۔ اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کون قلب ودماغ کے لحاظ سے ان سب سے بلند ہے اور کون بے یار ومددگار ہے کہ ہم اسکو منتخب کریں۔ اور لاکھوں پر بھاری بنادیں۔

غرض یہ ہے کہ تم کو اللہ کے معاملات میں دخل اندازی کا استحقاق نہیں ہے، وہ جو چاہے کرے اور جس شخص کو چاہے، برگزیدہ کرے۔

ایک واضح حقیقت

یہ بالکل سادہ اور واضح حقیقت ہے کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، مگر اتنی سی بات بھی مشرکوں کے دماغ میں نہیں آتی اور وہ اس کے سوا دوسروں کو اپنا معبود بنالیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کائنات کا نظم ونسق اُنکے ہاتھ میں ہے، ارشاد ہے کہ کیا تم نے کبھی اپنے معبودوں کی قوتوں کا جائزہ بھی لینے کی کوشش کی، کیا کبھی تم نے سوچا ہے کہ وہ کن اختیارات کے مالک ہیں اور کیا انکی بیچارگی اور عجز پر بھی تم نے نظر کی؟

بتاؤ کہ اگر آفتاب اور ماہتاب کا پیدا کرنیوالا اللہ دن کو روک لے اور آفتاب کو غروب نہ ہونے دے تو پھر یہ تمہارے خدا اور تمہارے مزعومہ معبود کیا تمہارے لئے پُرسکون رات کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ یہ تو اُسکی رحمت ونوازش ہے کہ اس نے لیل ونہار کے سلسلہ کو باقی رکھا، تاکہ رات کو تم آرام کرو اور دن بھر کی تکان دور کرو اور دن میں معاش ڈھونڈو، مگر تم ہو کہ ان حقائق پر غور نہیں کرتے۔ اور نہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو؟

وَلِتَبْتَغُواْ مِن فَضْلِهِ. کہہ کر اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ مال ودولت کا حصول تقویٰ اور پرہیزگاری کے منافی نہیں، بلکہ اللہ کے فضل کا اکتساب ہے۔ افلاس فی نفسہ اسلامی نقطہ نگاہ سے کوئی بہتر چیز نہیں ہے، بلکہ بعض حالات میں نہایت مذموم ہے، ہاں طبیعت کی مسکنت اللہ کو پسند ہے اور کبر وغرور ناپسند۔ ممکن ہے کہ ایک دولتمند آدمی طبیعت کا نہایت غریب ہو اور ایک مفلس ونادار بہت متکبر اور مغرور ہو، اس لئے اصل چیز اخلاق کے باب میں تونگری اور افلاس نہیں، بلکہ دل کا غنا اور دل کی مسکنت ہے۔

قارون کی رعونت

یہ آیات قارون کے متعلق ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ انسان بعض دفعہ مال ودولت کے نشہ میں کس درجہ سرشار ہوجاتا ہے اور تمام انسانی حقوق کو بُھول جاتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عیش وعشرت کی یہ فراوانی اللہ کے فضل اور بخشش کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ میری اپنی قوت بازو کا ثمرہ ہے اور میری عقل وفراست کا پھل ہے، اس لئے میرے مال ودولت میں اللہ کا کوئی حصہ نہیں۔

اس قسم کے لوگ عمومًا کم ظرف ہوتے ہیں عالی حوصلہ اور بلندمقام لوگ باوجود مالداری کے منکسر ہوتے ہیں اور بڑی فراخدلی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

قارون کی شخصیت کے متعلق مفصل معلوم نہیں کہ کون تھا، مفسرین نے مختلف قیاس آرائیاں کی ہیں، بعض کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام کے چچازاد بھائیوں میں سے تھا۔ اور بعض کے نزدیک چچا تھا، ایک رائے یہ بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا خالہ زاد بھائی تھا۔ بہرحال قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا۔

اللہ نے اس کو خوش حالی بخشی۔ مال ودولت سے نوازا۔ اور بے انتہا خزائن کا مالک بنایا، چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ اللہ کی ان بخششوں کا شکر ادا کرتا اور مخلوق خدا سے نہایت انکسار وعجز سے پیش آتا، مگر یہ لگا اکڑنے اور اترانے، قوم نے کہا، دیکھو بہت زیادہ غرور اور تمکنت اچھی نہیں، اپنے جامے میں رہو، کیونکہ اللہ کو ایسی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔ مال ودولت میں سے کچھ آخرت کے لئے بھی خرچ کرو۔ اور دنیا میں اللہ کو نہ بُھولو کہ آخرت میں خسارہ اٹھاؤ۔ لوگوں سے بھلائی کے ساتھ پیش آؤ، جس طرح کہ اللہ نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اور غرور وکبر سے ملک میں فساد نہ مچاتے پھرو۔

قارون نے جب یہ نصیحتیں سنیں۔ تو راہ عجب وتکبر کہنے لگا، اپنے وعظ کو رہنے دو۔ میرے مال میں اللہ کی بخششوں کو کوئی دخل نہیں، میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اپنی قابلیت سے حاصل کیا ہے۔

فرمایا۔ اس کمبخت کو معلوم نہیں کہ اس سے قبل کئی قوموں کو اللہ تعالیٰ ان کے غرور اور دنیا پرستی کی وجہ سے ہلاک کر چکا ہے اور وہ قومیں دولت وقوت میں اعوان وانصار میں اس سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں۔ یہ اپنے تھوڑے سے مال پر اترا رہا ہے اور یہاں چشم زدن میں زندگی کی تمام لذتیں چھین لی جاتی ہیں اور پوچھا تک نہیں جاتا۔

دولتمندوں سے متاثر ہونے والے

یہ ایک مخصوص واقعہ ہے، مگر مقصد یہ ہے کہ دولتمندوں کو عیش وعشرت میں مصروف دیکھ کر عموماً کمزور طبیعت کے دنیادار بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے تو یہ لوگ کس درجہ خوش قسمت ہیں، مگر اہل علم وعقل محض جاہ وثروت کے نظاروں سے فریب میں نہیں آتے، ان کی نگاہیں عاقبت پر لگی ہوتی ہیں۔ وہ ان ضعیف الایمان لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم دنیا کو کیوں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہو، آخرت کی طرف دھیان رکھ کہ وہ ایمانداروں کے لئے کہیں بہتر ہے۔ اور یاد رکھو عقبیٰ کا اجر صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا۔ افلاس وغربت سے گھبرا جانے والوں کو نہیں۔

نفسیات انسانی کا ادق تجزیہ

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نفسیات انسانی کا نہایت عمدہ تجزیہ کرکے دکھایا ہے کہ کس طرح اس کو کسی پہلو قرار نہیں یا تو یہ کیفیت تھی کہ جب قارون کو سج دھج میں محل سرائے سے نکلتے دیکھتے تو اُن کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش کہ ہم بھی اسی طرح مال ودولت سے بہرہ ور ہوتے اور یا اب یہ حالت ہے کہ قارون جب اپنے غرور کی وجہ سے زمین میں دھنس گیا تو یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کررہے ہیں کہ اُس نے اُن کو اس عذاب سے محفوظ رکھا اور گویا اب انکو احساس ہوا۔ منکرین کیلئے فوز وفلاح نہیں۔

انبیاء، منصب نبوت کے اُمیدوار نہیں ہوتے

انبیاء علیہم السلام کو جو منصب نبوت سے نوازا جاتا ہے تو اس طرح نہیں کہ وہ نبوت ورسالت کے امیدوار ہوتے ہیں اور بتدریج نبوت کے درجہ علیا تک ترقی کرلیتے ہیں، بلکہ اس طریق سے نبوت عطا کی جاتی ہے کہ ان کو پہلے سے مطلقاً معلوم نہیں ہوتا اور یکایک قدرت حق ان کو منتخب کرلیتی ہے اور وہ معارف ونکات کا دریا بہانے لگتے ہیں، ہاں یہ درست ہے کہ نبوت کی استعداد کا ہونا انبیاء میں ضروری ہے، تاکہ ان میں اور دوسرے لوگوں میں ایک قسم کا امتیاز ہو۔ ارشاد ہے کہ آپ کو پہلے سے توقع نہیں تھی کہ نبوت کی گرانبار ذمہ داریاں آپکے کندھوں پر ڈال دی جائیں گی، یہ تو آپ کے رب کا فضل اور اسکی مہربانی ہے کہ اُس نے آپکو ان خدمات پر مامور فرمایا ہے۔

قرآن کے اسلوب بیان کی نوعیت

یہ واضح رہے کہ قرآن میں بعض دفعہ حضور ﷺ کی سیرت کو بصیغہ امر بیان کیا جاتا ہے۔ جسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان آپکے اسوہ کی پیروی کریں۔ اور اپنے لئے حضورؐ کی زندگی کو مستقل راہ بنائیں، مگر جو لوگ قرآن کے اسلوب بیان سے آگاہ نہیں، غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید یہ باتیں حضور ﷺ میں موجود نہیں ہیں، یا خطرہ تھا کہ ان باتوں کی آپ مخالفت کریں گے، اسلئے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو بصوتِ اوامر واحکام پیش کیا ہے۔

مثال کے طور پر ان آیات پر غور کیجئے۔ ان میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) آپ کافروں اور مجرموں کی تائید نہ فرمایئے (۲) اللہ کے احکام کی پیروی سے یہ لوگ آپکو روک نہ دیں (۳) ایک اللہ کی دعوت دیتے رہیئے اور شرک نہ کیجئے (۴) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو ساجھی سمجھ کر نہ پکارا کیجئے۔

ظاہر ہے کہ یہ اسوہ ہے، احکام نہیں ہیں، آپ نے ساری زندگی میں کبھی جرم اور گناہ کی تائید نہیں فرمائی، کبھی احکام کی پیروی میں تغافل نہیں فرمایا۔ ہمیشہ ایک اللہ کی دعوت دیتے رہے۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا ہو۔

ان حالت میں بعض بدباطن مشنریوں کا ان آیات سے غلط استفادہ کرنا۔ اور کہنا کہ معاذ اللہ حضورؐ سے ان گناہوں کے صدور کا احتمال تھا، اس لئے ان سے روکا گیا ہے، محض نادانی اور علوم قرآن سے ناواقفیت ہے۔

نجات کا سچا اور سادہ نظریہ

اگر انسان یہ چاہے کہ گناہوں اور لغزشوں سے وہ بالکل پاک رہے اور قطعاً اس سے کسی نوع کی غلطی کا صدور نہ ہو تو یہ ایک ایسی آرزو ہے، جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔

انسان، فطرت اور ساخت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ کبھی کبھی خواہشات نفس کی رو میں بہہ جائے۔ اس لئے وہ مذہب، جو انسان سے سو فی صدی نیک رہنے کا مطالبہ کرتا ہے غلط ہے اور اس کا پیش کرنیوالا انسانی نفسیات سے محض آشنا اور ناواقف ہے۔

دیکھئے، اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے کہا، کیا آپ ایسے شخص کو نیابت سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں، جو سنگین گناہوں کا ارتکاب کریگا۔ **وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ.** تو اللہ نے اس کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ نہیں بنی آدم بڑے پاک اور پارسا ہونگے اور تزہد وتورع میں وہ تم سے بھی آگے ہوں گے۔ بلکہ ارشاد فرمایا کہ **إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ** . یعنی میں تمہاری پاک بازی کو دیکھ چکا، اب نبی آدم کے گناہ اور لغزشیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم میرے اسرار ومصالح سے آگاہ نہیں، اس لئے خاموش رہو۔

معلوم ہوا کہ لغزشیں، کوتاہیاں اور بعض حالات میں گناہوں کا صدور انسان سے ممکن ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نجات کے کیا معنی ہیں اور گناہوں سے مخلصی کسے کہتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے، تم اللہ پر ایمان رکھو، اسکے پروگرام کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرو۔ اُسکے بعد جو غلطیاں بتقاضائے بشریت تم سے سرزد ہوجائیں گی، ان کو اللہ تعالیٰ بخش دینگے اور پھر تمہارے اعمال حسنہ کا ثواب کئی گنا کرکے اپنی طرف سے بڑھا دینگے؟ اور تم کو جنت ونعیم کے لذائذ سے بہرہ اندوز ہونے کیلئے آزاد چھوڑ دینگے۔ یہی اسلامی نجات اور طریق مخلصی ہے، ملاحظہ فرمایئے، اس میں کس درجہ فطرت کے ساتھ توافق ہے اور نجات کا کس قدر صحیح اور سچا نظریہ ہے، جس میں نہ تناسخ کا چکر ہے، نہ صلیب کی الجھن ہے۔ سیدھی سادھی بات ہے کہ بالعموم اللہ کی فرمانبرداری کرو اور آقا کے احکام بجا لاؤ۔ وہ تمہیں اجر دیگا، انعام دے گا اور تمہاری لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف بھی کردے گا۔

لاتزر وازرة وزراخریٰ

بات یہ ہے کہ جب منکرین اسلام مسلمانوں کو کہتے کہ تم باوجود افلاس وغربت اور تکالیف ومصائب کے اسلام کی امانتِ عزیز کو کیوں سینوں سے چمٹائے ہوئے ہو اور کیا وجہ ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہ مل کر، مادی لذائذ سے محروم رہو تو مسلمان کہتے کہ یہ تمہارا کہنا درست ہے کہ اسلام کو ترک کرکے ایک گونہ دنیا کی مسرتیں حاصل ہوجاتی ہیں، مگر آخرت اور عقبیٰ میں کیا ہوگا، وہاں کون شخص اللہ کے عذاب سے چھڑائیگا۔ اور کون ہے جو وہاں کی کفالت لیتا ہے اور عذاب سے رہائی کا ٹھیکہدار بنتا ہے۔ تو اس پر وہ نہایت دیدہ دلیری اور بیوقوفی سے کہتے، کچھ پرواہ نہیں، تم ہمارے مسلک کفر وگمراہی کو قبول کرلو، ہم تمہارے گناہوں کا ذمہ لیتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے، یہ لوگ ان مسلمانوں کو گناہوں کے بارسے تو کیا مخلصی عطا کریں گے، البتہ خود اپنی پیٹھ پر اپنے گناہوں کے علاوہ ان کے گناہ بھی لادینگے اور دگنے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے گناہوں کی ذمہ داری کوئی شخص نہیں اُٹھا سکتا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کے گناہوں کو بخشوا دونگا، کیونکہ گناہ کا تعلق براہِ راست ہر فرد سے ہے اور ہر فرد، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کا جوابدہ ہے۔

لواطت کے نقصانات

حضرت لوطؑ کا پیغامِ خصوصی یہی تھا کہ وہ سدومیوں کو اس لعنت سے بچائیں اور ان کو بتائیں کہ تمہاری یہ حرکات نوع انسانی کے لئے نہایت شرمناک اور مضر ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ تم عورتوں کو چھوڑ کر لونڈوں سے جذبات شہوت کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نسل انسانی منقطع ہوجائے گی۔ **وَتَقْطَعُونَ السَّبِيْلَ.** اس سے یہی مقصود ہے کہ تمہارے ان افعال سے افزائش نسل کی راہیں مسدود ہوجائیں گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ فعل عنداللہ اس درجہ مبغوض کیوں ہے کہ اللہ نے اس کے انسداد کے لئے حضرت لوطؑ کو رسول بنا کر بھیجا اور آخر میں انکار کی وجہ سے ان کو ہلاک کردیا گیا، بعض یونانی اخلاقیئن نے اس کو بے ضرر کلچر کے نام سے موسوم کیا ہے، لیکن انہوں نے اسکی بہت سی خرابیوں پر گہری نظر نہیں ڈالی۔ جن میں سے کچھ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

ا۔ طبی اور عضویاتی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس مرض کے لوگ جنسی اعتبار سے بالکل بے کار اور ''عنین'' ہوجاتے ہیں۔

۲۔ اخلاقی لحاظ سے قوم میں بزدلی، بد دلی، یاس اور قنوط کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔

۳۔ اجتماعی نقصانات یہ ہیں کہ سماج میں فواحش کا رواج اور غلبہ ہوجاتا ہے۔

۴۔ دماغی پستی اس کا لازمی اور محوری نتیجہ ہے۔

۵۔ جونسل پیدا ہوتی ہے، وہ کمزور۔ بیمار۔ اور موت کا جلد لقمہ ہوتی ہے۔

۶۔ عورتیں، مردوں کی فطری رفاقت سے عموماً محروم ہوجاتی ہیں۔

سب سے بڑا جامع نقصان وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے کہ باہمت۔ شان دار اور مضبوط نسل کا انقطاع ہوجاتا ہے۔

الغرض حضرت لوطؑ نے جب ان لوگوں کو پاکبازی کی تلقین کی اور بتایا کہ تمہارے یہ افعال نہایت برے ہیں اور اس لائق ہیں کہ اللہ کا عذاب تم پر آئے۔ اور تم کو ہلاک کردے۔ تو انہوں نے از راہ بدبختی اور اور محرومی بجائے توبہ واستغفار کے عذاب طلب کیا، چنانچہ اللہ کے فرشتے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے، اُن کو بیٹے کی خوشخبری دی اور پھر کہا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور سدومیوں کو ہلاک کردینے کا قصد ہے۔

ابراہیمؑ نے کہا اس بستی میں تو لوط بھی رہتے ہیں۔فرشتوں نے کہا، ہم جانتے ہیں۔ اس کو اور اس کے ماننے والوں کو، بجز اس کی منکر بیوی کے ہم نجات دیں گے اور عذاب سے بچالیں گے اور باقی بدکرداروں کے لئے ہلاکت مقدر ہے، اس کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ وہ ان کو دیکھ کر خوف زدہ اور رنجیدہ ہوئے کہ تباہی کا وقت آ گیا۔

فرشتوں نے تسلی دی اور کہا کہ آپ کو اور آپ کے عقیدتمندوں کو بچا لیا جائے گا، البتہ اس کی بیوی معذبین میں سے ہے، کیونکہ اس نے پُرانی بدرسموں کا ساتھ دیا۔ اور توحید وپاکیزگی کے پروگرام پر کان نہ دھرا۔

باغی قوموں کے ساتھ اللہ کا قانون

ان آیات میں تذکیر بایام اللہ کے تحت ہلاک شدہ قوموں کا ذکر ہے کہ کیونکر انہوں نے حق وصداقت کو ٹھکرایا اور کیونکر عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ ارشاد ہے کہ مدین والوں کے پاس ہم نے حضرت شعیبؑ کو بھیجا۔انہوں نے کہا، اے قوم ایک اللہ کی عبادت کرو۔ توحید اصل دین ہے، فطرت کا تقاضا ہے۔ دل کی آواز ہے۔ معقول اور صحیح عقیدہ ہے۔ اور یوم آخرت کے محاسبہ سے ڈرو کہ ایمان بالآخرت سے دلوں میں نیکی کی تحریص پیدا ہوتی ہے اور کفر اختیار کرکے زمین میں فساد نہ مچاؤ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر بجائے خود تخریب ہے، تباہی ہے اور ہلاکت ہے۔ اور جو لوگ انبیاء کے پیش کردہ نظام کو نہیں مانتے، وہ عالم کون ومکان کو غارت کردینے میں براہ راست ممد ومعاون ہوتے ہیں۔

ان لوگوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کی آواز پر کان نہ دھرا۔ اور روائتی بدبختی سے کام لیتے ہوئے، ان کی تکذیب کی۔ اور کفر وشرک پر مصر رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ قیامت خیز زلزلہ آیا اور عبرت بنا گیا۔

پھر دیکھو کہ عاد اور ثمود کی بستیاں کس طرح اُلٹ گئیں۔

شیطان نے اُن کے اعمال کو سنوار کر پیش کیا اور راہ راست سے روکا اور باوجود ہوشیار اور سمجھ دار ہونے کے اس کے داؤں میں آ گئے۔

قارون کے حالات سنو کہ سرمایہ داری نے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ وہ دولت کے نشہ میں اس درجہ سرشار ہوا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بالکل بھول گیا اور کہنے لگا کہ میرے مال میں اللہ کا کوئی حصہ نہیں، میں نے اپنے خزائن دولت کو اپنی عقل وفراست سے پیدا کیا ہے، اُس میں اللہ کے فضل اور اُس کی بخشش کو کوئی دخل نہیں، اس لئے میں نہ تو اُس کی راہ میں کچھ دینے کو تیار ہوں اور نہ اُس کے دین کو مانتا ہوں۔

اسی طرح فرعون اور ہامان علو واقتدار کی خواہش میں اندھے ہوگئے اور ہر چند حضرت موسیٰؑ نے ان کے سامنے دلائل رکھے اور ان کو حق اور سچائی کی دعوت دی، مگر انہوں نے کبر وغرور کو نہ چھوڑا اور کسی طرح بنی اسرائیل کو آزادی نہ دی۔

اللہ، عذاب کو پسند نہیں کرتا

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ . سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کا عذاب اس طرح نہیں آتا کہ وہ یونہی بلاکسی عذر اور وجہ کے غیض وغضب سے بے تاب ہوجائے اور اپنے بندوں کو ہلاک کردے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جب بندے اُس کی مہربانیوں کو ٹھکرادیتے ہیں اس کے پیغام محبت وشفقت کو نہیں مانتے، جب وہ بلاتا ہے اور یہ اکڑتے ہیں، جب وہ فضل وکرم سے نوازنا چاہتا ہے تو یہ اپنے لئے غضب اور ناراضگی کو پسند کرتے ہیں، جب وہ جنت کے دروازوں کو وا کرتا ہے اور یہ جہنم کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہ انہیں باقی رکھنا چاہتا ہے، اور یہ فنا کی طرف لپکتے ہیں۔ اور جب وہ انہیں دنیا کی سرداری بخشنا چاہتا ہے تو یہ ذلت ورسوائی اختیار کرتے ہیں تو اس وقت اس کا قاعدہ ہے کہ ایسے ناشکروں اور نااہلوں سے

زمین پاک کردیا جائے۔

نماز برائیوں سے روکتی ہے

مقصد یہ ہے کہ حضور کو تسلی دی جائے اور بتایا جائے کہ آپ کا کام اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں۔ یہ آپ کے فرائض میں داخل نہیں کہ لابد آپ ان کے دلوں تک رسائی حاصل کریں۔ اور زبردستی ایمان کی دولت ان کے سپرد کردیں۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری تھا کہ گذشتہ اقوام وملل کے حالات بتلائے جائیں۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ آپ قرآن پڑھیں اور دیکھیں کہ باوجود انبیاء کی سعی بلیغ کے انسانوں کا کثیر طبقہ رشد وہدایت سے محروم رہا۔ اس لئے اگر یہ لوگ بھی ان بدبختانِ ازلی میں داخل ہوں۔ اور قرآن کی برکاتِ سعادت حاصل نہ کریں تو آپ قطعاً تکلیف اور کوفت محسوس نہ کریں۔

نماز کے متعلق یہ تصریح ہے کہ اس کے قیام سے مسلمان میں ترک فواحش کی زبردست استعداد پیدا ہوجاتی ہے اور نمازی کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کی جرأت کرسکے، اس کے دل میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ جو اسے ہر بُرائی کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ نماز کے معنی یہ ہیں کہ ایک گناہگار انسان اللہ سے پاکبازی کا عہد کرتا ہے۔ اور دن رات میں پانچ وقت برابر اللہ کے حضور میں پیش ہوتا ہے۔ یہ ایسا تعلق اور ایسی وابستگی ہے۔ کہ جس کے ساتھ گناہوں کا اجتماع محال ہے۔ نمازی نفس کی تمام خواہشات کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ اور اپنے کو کامل طور پر اللہ کے سامنے جُھکا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مظاہر عبودیت کی تکرار انسان کو مکمل مطیع ومنقاد بنا دیتی ہے۔ اور اس طرح کی مشق نیازمندی سے انسان لامحالہ زہدو ورع کی انتہائی بلندیوں پر متمکن ہوجاتا ہے۔ مگر یہ کیفیت اس وقت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ نماز کو اسکی روح اور معنویت کے ساتھ ادا کیا جائے۔ جب اس کو سچے معنوں میں عبادت قرار دیا جائے اور اسکی تمام شروط لازمہ کا خیال رکھا جائے۔ خضوع وخشوع کا دلوں پر غلبہ ہو۔ اور مقام احسان نگاہوں سے اوجھل نہ ہو۔

امی نبیؐ امتیازی خصوصیات

اس آیت میں قرآن حضور کی شان اُمت کو پیش کرتا ہے کہ وہ شخص جس نے توحید کے اسرار ورموز کو واشگاف طور پر بیان کیا، جس نے انسانوں کی صحیح راہ نمائی کی، جس نے مذہب کی مشکل گتھیوں کو آن کی آن میں نہایت آسانی سے سلجھا دیا، جس نے نفس عقل کو حیران ششدر کر دیا، جس کی حکمت حکمت بالغہ، جس کا فرمان، فرمان فطرت جو دنیا جہان کا محبوب ہے، جس کے ادنیٰ خادموں کی غلامی فلسفہ نے صدیوں تک کی۔ جس نے قرآن ایسی عظمت الشان کتاب پیش کی، جس نے قیامت تک کے لئے دماغوں کو مخاطب کرکے کہا کہ اگر تمہیں اسکی عظمت میں کلام ہے تو آؤ اس کا مقابلہ کرکے دیکھ لو وہ اُمی تھا۔ اُس نے کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ وہ ذہن وقلب کے لحاظ سے کسی انسان کا ممنون احسان نہیں، ورنہ کہنے والوں کو موقع ملتا کہ یہ کلام اُن کا اپنا کلام ہے جو اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

ہجرت اور اس کے ثمرات

اسلام، چونکہ تہذیب وتمدن اور عقائد وعبادات کے لحاظ یہ ایسا مذہب نہیں ہے، جس میں کسی خاص ماحول یا فضا کے ساتھ دینی اختصاص ہو۔ اس لئے وہ بالطبع قیود وطن سے آزاد ہے۔ اسکے نزدیک ہر وہ خطہ ارض وطن ہے۔ جہاں مسلمان صحیح اسلامی زندگی بسر کرسکے اور ہر وہ جگہ چھوڑ دینے کے لائق ہے، جہاں دین کی آزادی میسر نہیں۔ اگرچہ وہ مکہ جیسی متبرک جگہ ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام، ایسا کامل اور ہمہ صداقت مذہب ہے کہ وہ مکان ونسان کی حدود سے بے نیاز ہے۔ ساری دنیا کی وسعتیں اُس کا صحن مکانی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ **ارضی واسعة** یعنی میری زمین میرے مومن بندوں پر کشادہ ہے، مقصد یہ ہے کہ ملکی رسم ورواج یا ملک کا مستبدانہ قانون مسلمان کی روحِ آزادی کو نہ کچل دے، مسلمان کو ہرآن لازم ہے کہ اسکے دل اور جسم پر بجز رب کعبہ کے کسی کی حکومت نہ ہو، وہ جب جُھکے، اسکے سامنے جُھکے اور جب محبت کا اظہار کرے تو اسی سے کرے۔

ان آیات میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ ہر نفس کیلئے موت مقدر ہے، ہر شخص کو مرنا ہے۔ چاہے وہ جلالت قدر اور عظمت میں ساری دنیا سے بڑھا ہوا ہو، اسلئے اُسے دنیا کی زندگی میں سوچ لینا چاہیئے کہ کہیں ہجرت وجہاد سے تحلف اس بنا پر نہیں کر

موت سے حالت ہے اور ہجرت وجہاد کو ہلاکت کا سبب سمجھتا ہے۔ اگر جبن وبزدلی کا یہ جذبہ دل میں ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئیے کہ موت کیلئے کوئی جگہ یا وقت اور کیفیت کا سوال نہیں۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ آسکتی ہے، اسکے حملوں سے کوئی شخص نہ کبھی بچا ہے اور نہ بچ سکتا ہے۔ پھر کیا یہ صورت بہتر نہیں کہ اللہ کی راہ میں اسکے دین کی سربلندی اور اسکی آزادانہ تبلیغ واشاعت میں ہم موت سے ہم کنار ہوں؟ ارشاد ہے کہ وہ لوگ جو ایمان کی نعمت سے کما حقہ بہرہ ور ہیں۔ جنہیں دولت ایمان فی الحقیقت عزیز ہے اور جو عمل وسعی کا پیکر ہیں، وہ اگر دنیا میں ہمارے لئے اپنی محبوب ترین آسائشیوں کو چھوڑ دیتے ہیں تو ہم بھی انکے لئے کچھ کم مہربانیوں اور شفقتوں کا اظہار نہیں کرتے۔ ہم اخروی زندگی میں ان مکانوں سے کہیں بہتر مکان ان کو رہنے کے لئے دینگے، جنکو وہ ہماری خاطر چھوڑ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں سعی وعمل کا نہایت عمدہ صلہ ہے۔ ہاں اس تصور اجر کو تسلیم کرنے کیلئے اور ہجرت پر آمادہ ہونیکے لئے زبردست صبر وتوکل کی ضرورت ہے۔ ہر شخص کے یہ بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کیلئے اپنا تمام متاع لٹا دے اور ہجرت کی صعوبتوں اور کلفتوں کو برداشت کرے۔

دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے، جنکی ساری کوششیں فکر معاش پر مرکوز ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑی ذمہ داری قدرت کی جانب سے ان پر عائد نہیں ہوتی۔ دن رات اسی غم میں گھلے جارہے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لئے ہجرت کا مسئلہ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ ٹیڑھا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت تو بمشکل تگ ودو کرکے برسوں کی محنت ورسوخ سے روزی مل رہی ہے، جب اپنا ملک چھوڑ دیں گے اور بالکل غیروں کے ہاں جا کر بسیں گے تو پھر کھائیں گے کہاں سے؟ ان پیٹ کے بندوں سے اس آیت میں تخاطب ہے کہ کم بختو، تم کسقدر کوتاہ ہمت ہو، اللہ پر تمہارا بھروسہ کس درجہ کم ہے۔ تم حیوانات سے بھی گذر گئے ہو، دیکھو، وہ باوجود عقل وخرد کی کوتاہی کے فکر معاش سے کتنے بے پرواہ ہیں۔ وہ دن کو کھانا کھا کر کبھی رات کے کھانے کی فکر میں غلطاں وپیچاں نہیں رہتے اور رات کو دن کی فکر میں نہیں گھلتے، اللہ برابر ان کو کھانا دیتا ہے، تمہیں رزق کی تقسیم پر مقرر نہیں کیا گیا ہے، تم خود آپ اپنے رازق نہیں ہو۔ تمام کائنات کو وہی دیتا ہے، تم کو بھی وہی دیگا، توکل اور بھروسہ شرط ہے۔

توحید کا اقرار

توحید کے متعلق اسلامی نظریہ یہ ہے کہ فطرت کا عقیدہ ہے، دل کی آواز ہے اور ایسی صداقت ہے، جس کا انکار ہوش وحواس کی سلامتی میں قطعاً ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم فرماتا ہے کہ جب ان مکہ کے مشرکوں سے پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ، آسمانوں اور زمین کو کس نے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے؟ تو یہ لوگ بے اختیار چلا اُٹھتے ہیں کہ خدا نے، وہی رزق کو بانٹتا ہے اور کشائش وتنگی اُسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ اسی طرح جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ جس وقت زمین اپنی تروتازگی کھو بیٹھتی ہے، باغ پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستے ہیں، جب کھیتیاں خشک ہوجاتی ہیں تو اس وقت کون پانی برساتا ہے، کس کی رحمت جوش میں آتی ہے اور کون چند لمحوں میں جل تھل کر دیتا ہے۔ ان سب باتوں کا جواب یہی ہے کہ اللہ، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حقیقت جو ان کے لبوں تک آتی ہے، دراصل فطرت کی آواز ہے۔ دل کی گہرائیوں کی صدا ہے۔ مگر یہ لوگ دنیا کی عشرتوں میں پڑکر اس درجہ غافل ہوجاتے ہیں کہ دل باتیں سننے کے لئے ان کے پاس فرصت ہی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روشنی ماند پڑجاتی ہے یہ آواز ہزاروں خواہشوں تلے دب جاتی ہے اور اس وقت ظاہر ہوتی ہے، جب یکا یک کوئی مصیبت ان کو گھیر لیتی ہے۔ اور یہ مخلصی کی کوئی راہ نہیں پاتے۔ جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور موجیں چاروں طرف سے موت کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ اور بڑھ بڑھ کر ان کو سناتی ہیں۔ اور اس شوروغل میں یہ حواس کھو بیٹھتے ہیں تو ٹھیک اس وقت فطرت خوابیدہ بیدار ہوتی ہے اور دل کی روشنی بروئے کار آتی ہے اور خواہشات سے دبی ہوئی آواز لب تک آنے کی جرأت کرتی ہے۔ اس وقت یہ لوگ بڑے خلوص اور بڑی صداقت سے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور جب یہ مصیبت دور ہوجاتی ہے، زندگی کے جذبات پھر ان کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ اور یہ پھر اللہ کو بھول جاتے ہیں، اور پھر دیوی دیوتاؤں کو پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔

انسانی فطرت کی سچی تصویر کشی

انسان کی نفسیات عبرت کی کتنی سچی تصویر اللہ نے کھینچی ہے، کہ یہ مصیبت کے وقت

تو اللہ کی طرف دوڑتا اور لپکتا ہے۔ مگر مسرت میں اس کو بھول جاتا ہے۔

ان آیات کے ضمن میں بتایا ہے کہ وہ دنیا، جو اس کے لئے گمراہی کا باعث ہوتی ہے۔ اپنے رتبے اور مقام کے لحاظ سے کس درجہ حقیر اور ذلیل ہے، اسکی بے ثباتی اور فنا پذیری کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض گھروندا ہے، ایک کھیل ہے، تماشا ہے، مگر لوگ بے سمجھ ہیں کہ اس پر جان تک فدا کررہے ہیں۔ کیا دانائی اور عقلمندی کا یہ تقاضا نہیں کہ دائمی اور ابدی زندگی کے لئے کوشش کی جائے۔ اور آخرت کے لئے راہ سفر مہیا کیا جائے۔

دار آخرت کو **لھی الحیوان** کے لفظ سے تعبیر کرکے قرآن نے اس نظریہ کی تائید فرمائی ہے۔ کہ زندگی غیر منقطع اور مسلسل ہے اور موت کے معنی محض یہ ہیں کہ انسان ایک عارضی لباس کو کینچلی کی طرح اتار پھینکتا ہے اور ایک دوسرا جاودانی لباس پہن لیتا ہے۔

فیوضِ رحمت کی بارش

عرفان اور سلوک کی وسعتیں بے انتہا ہیں اور مجاہدین ذات وتفرید کے لئے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے تجلیات وانوار کا پورا پورا احاطہ کر لیا ہے، جس قدر اس خطیرہ قدس کا قرب حاصل ہوگا، اسی تناسب سے نظروں میں وسعت پیدا ہوگی اور معلوم ہوگا کہ ہزار دوہزار پردے درمیان میں حائل ہیں اور مقامات واحوال کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ان سب پر کسی شخص کا احاطہ ناممکن ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جدوجہد کرنیوالوں کے لئے اللہ کی طرف سے توفیق وتیسر ارزانی ہے اور سالک ایک قسم کی اعانت اور شفقت محسوس کرتا ہے۔ یعنی ہمت اور خلوص شرط ہے۔ پروردگار عالم کے فیوض رحمت کی بارش کمزور اور ناتوان انسان پر ہمیشہ ہوتی ہے۔

تعلیمات اسلامی کا عقل پر مبنی ہونا

قرآن حکیم میں یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کی بنیاد غور وفکر پر رکھتا ہے۔ اور ہر شخص سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ وہ سوچے سمجھے اور حقیقت کو خوب اچھی طرح پرکھے۔ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ محض مرعوب ہو کر اسکو تسلیم کر لیں۔ اور ان کے دل مطمئن نہ ہوں۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ طالب حق ہر طرح کے شکوک سے دماغ کو پاک کرلے اور پوری طرح حلاوتِ ایمان سے بہرہ ور ہو۔ قرآن حکیم کو اپنے عقائد پر اس درجہ یقین ہے کہ وہ عقل وخرد کی جانچ کے سوال کو خود بیدار کرتا ہے۔ اور نبردآزمائی کی دعوت دیتا ہے۔ اُس کی رائے میں جہاں تک سچائی اور صداقت کا تعلق ہے۔ اسکو فطرت اور عقل سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور نہ صرف خطرہ، بلکہ عقل وفکر کا ارتقاء اُسکے حقائق کو اور زیادہ روشنی میں لے آتا ہے۔ کیونکہ اسلام بجائے خود نام ہے۔ صداقت کا سچائی کا۔ فطرت کا۔ اور تجربات عقل وفکر کے پیش رس نتائج کا۔

اس آیت میں یہی کہا گیا ہے۔ کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے اور اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہ ایک دن اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کے متعلق آخری فیصلہ سننا ہے انکو چاہیئے کہ عقل وہوش سے کام لیں۔ اور سوچیں کہ اگر مکافاتِ عمل کا اصول غلط اور بے معنی ہے۔ تو پھر اس نظام کائنات کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے اگر انسان اپنے اعمال میں بالکل آزاد ہے اور مرنے کے بعد زندگی ختم ہوجاتی ہے اور اس کے بعد کوئی پرسش نہیں ہونیوالی ہے۔ تو پھر زندگی کے اس بکھیڑے سے کیا مطلب ہے ۔ یہ زمین وآسمان کی وسعتیں اور بلندیاں کیوں ہیں۔ اور ایسا کیوں ہے کہ روزانہ آفتاب ہماری خدمت کیلئے چمکتا ہے۔ اور چاند متحرک ہے اور ستارے مصروف گردش ہیں۔ آخر حقیر انسان کی یہ خاطر داریاں کیا محض بے مقصد ہیں؟ یا یہ درست ہے کہ ان ساری نعمتوں کے مقابلہ میں انسان سے پوچھا جائے گا۔ کہ اُس نے آخرت کے لئے کیا زاد مہیا کیا ہے۔ اور کیسا توشہ جمع کیا ہے؟

فلسفہ ازواج

قرآن حکیم میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ نہایت اختصار کے ساتھ بعض دفعہ اشاروں اشاروں میں وہ وہ نکات سمجھا دیتا ہے۔ کہ عقل وفراست کے کئی دفتر بھی انکا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

غور فرمایئے۔ معاشرتی صورت حال میں یہ کتنا اہم مسئلہ ہے۔ کہ عورت کا درجہ ازدواجی نقطہ نگاہ سے کیا ہے؟ اور کیونکر زندگی کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ ان تعلقات سے مقصود جنسی اور معاشرتی تسکین ہے۔ قلب وروح کی طمانیت ہے۔ **لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا**. اور اسکو صحیح معنوں میں خوشگوار بنانے کا طریق یہ ہے کہ دونوں فریقین

برابر کی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مرد اپنی قوت وتوانائی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ اور عورت کے حق میں ہمیشہ رحمت وشفقت سے کام لیں۔ اور عورت اپنے حسن وجمال پر مغرور نہ ہو، بلکہ خاوند کے لئے اپنے دل میں محبت ومودّت کے جذبات کی ترتیب کرے۔ **وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً.**

اس ایک آیت میں قرآن نے معجزانہ طریق سے فلسفۂ معاشرت کا ایک سمندر بند کر دیا ہے۔ مقام اور منصب کا تعین فرمایا ہے۔ کہ عورت سکون وطمانیت آفرین شخصیت ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس سکون کو کیونکر عمل زندگی میں پیدا کیا جانا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ اِن باتوں میں سوچنے اور غور کرنے والوں کے لئے کئی نشانیاں ہیں۔ **لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ.**

ان تمام آیات میں فکر وعلم کی دعوت ہے۔ اور کہا گیا ہے۔ کہ کائنات کے اسرارورموز پر غور کرو۔ اور یہ دیکھو کہ یہ کارگار حیات کس درجہ کامل وجامع قوانین پر قائم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرو۔ زبانوں اور رنگتوں کے اختلافات کو گہری نظر سے دیکھو۔ فطرت کا ہر مظہر تمہارے آرام اور تمہاری آسائش وآسودگی کے لئے ہے۔ رات کو دن کے تھکے ہارے سوجاتے ہیں۔ دن کو روشنی میں اپنا کام کاج کرتے ہو۔ یہ تقسیم کتنی ضروری ہے؟ آسمان پر بادل گھر کر آتے ہیں بجلی گونجتی ہے۔ تم ڈرتے بھی ہو اور امید بھی رکھتے ہو۔ کہ اگر بارش ہوجائے۔ تو مُردہ اور خشک زمین زندہ ہوجائے گی۔ کھیت لہلہا اُٹھیں گے۔ اسی طرح ہواؤں اور بادلوں کا علم تمہاری زراعت کیلئے از بس ضروری ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ ستارے کیونکر اپنے مدار اور محور پر قائم ہیں۔ اور زمین کس طرح اُس کے حکم سے اپنی جگہ پر استوار ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ آفتاب اپنی طرف کھینچ لے جائے۔ اور ساری کائنات وقت مقررہ مقرر سے پہلے درہم وبرہم ہوجائے۔ جب وہ متعین وقت آجائے گا۔ اس وقت یہ تمام قانون معطل ہوجائیں گے۔ اور انکی جگہ دوسرے قوانین پھر ایک دفعہ تم سب زمین میں سے نکلوگے اور اس کے حضور میں پیش کئے جاؤگے۔ زمین وآسمان کی ہر چیز اسکے تابع ہے اور کسی شئے میں انگارہ کشی کی تاب وتواں نہیں۔

غرض یہ ہے کہ مرد مسلم کی نگاہیں آفاق گیر ہونی چاہئیں۔ اسکو کائنات کی ہر چیز پر غور کرنا چاہیئے۔ اسکے لئے طبیعات کا دفتر بے پایان پڑھنا اور کائنات کے اسرار ورموز پر فلسفیانہ غور کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ فقہ ومسائل کا جاننا۔ احکام وشریعت سے آگاہی حاصل کرنا۔

مذہب کا جدید ترین معیار

آج مذہب کیلئے جدید ترین معیار صداقت یہ ہے کہ وہ فطرت کے آئین کے مطابق ہو۔ آج یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ ان قوانین میں جو مہروماہ میں اور جبل وکاہ میں کارفرما ہیں۔ اور ان اخلاقی قوانین کے منبع وسرچشمہ میں کوئی فرق نہیں۔ جن کو ہم شریعت یا مذہب کہتے ہیں۔ وہ اقلیم مادیت کے ضابطے ہیں۔ اور یہ دنیائے روحانیت کے قوانین۔ دونوں کا سرچشمہ فطرت اور اُس کا غیرمبدّل حُسن ہے۔ قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال قبل اس حقیقت کو اتنا جامع اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مذہب کا اتنا تخیل اور اتنا واضح انداز بیان! یہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ قرآن اُس ذات کا کلام ہے جس کی نظر زمان ومکان کی بعید ترین وسعتوں سے بھی کہیں آگے ہے۔ ارشاد ہے کہ اطاعت وفرمانبرداری کا جذبہ فطری ہے اور غیرمبدل اور ہی دین قیم ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔ اور وہ مذہب کو اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں۔

نماز نہ پڑھنا شرک ہے

ان آیتوں میں تین چیزوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک تو یہ بتایا ہے کہ نماز نہ پڑھنا اعلانیہ شرک کا ارتکاب کرنا ہے۔ دوسرے یہ فرمایا ہے کہ تفریق وتشتت پیدا کرنا مشرکین کی صفت ہے اور تیسرے یہ ارشاد ہے کہ اختلاف اور گروہ بندی کیلئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ یوں تو ہر گروہ اپنے پاس کچھ ایسے دلائل رکھتا ہے جسکی وجہ سے وہ شاداں وفرحاں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو کسی عنوان گروہ بندی اور فرقہ سازی پسند نہیں۔

غور فرمایئے۔ نماز مسلمانوں کیلئے کتنی ضروری ہے اسکے بغیر یہ سمجھنا کہ ہم مسلمان ہیں۔ کیا محض حُسن ظن نہیں ہے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا۔ وہ مشرکین کی سی عادات کا حامل ہوجاتا ہے۔ اور آپ نمازیں نہ پڑھ کر بھی پکے مسلمان ہیں؟ یہ کیسا اسلام ہے؟ نماز نہ پڑھنا شرک اسلئے ہے کہ یہ اللہ کے سب احکام سے زیادہ موکدہ حکم ہے۔ پھر

اگر ایک شخص اسکو مان کر بھی عملاً منکر ہے۔ تو ظاہر ہے کہ کوئی چیز اس سے بھی زیادہ اسکے نزدیک اہم ہوگی۔ جسکو وہ نہیں چھوڑ سکتا۔ اور جس کے لئے نماز کو چھوڑ دیتا ہے۔ یاد رہے کہ یہی شرک ہے کہ خدا کے احکام کے برابر کسی دوسری چیز کو اہمیت دی جائے۔ اور یہ سمجھا جائے۔ کہ یہ چیزیں اتنی ہی ضروری ہیں جتنی کہ خدا کی باتیں ضروری ہیں۔ اور لائق اعتناء ہیں۔

اسلام دین اخوات ہے۔ دین وحدت ہے۔ اس کا منشا ہے کہ تمام انسانوں کو مضبوط لڑی میں منسلک کردے۔ پھر ان کا اگر آپس میں اختلاف ہو تو اسکے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ اسلامی نظام عمل کی برکات سے حقیقتاً محروم ہیں۔ قرآن حکیم کے نزدیک اس سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں ہوسکتا ہے۔ کہ مسلمان، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح مختلف جماعتوں اور عصبیتوں میں بٹ جائیں اور اسلامی روح سے بے بہرہ ہوجائیں۔ اسی لئے طبعًا وہ ہراس دلیل کو پسند نہیں کرتا۔ جس کو اختلاف کے جواز کے سلسلے میں پیش کیا جائے۔ وہ تمام دنیائے اسلام کو ایک نوع اور ایک جنس قرار دیتا ہے۔ وہ ایک تہذیب اور کلچر دیکھنا چاہتا ہے۔ اسکی خواہش ہے کہ صرف اسلامی عصبیت اور اسلامی نظریات ہی مقبول ہو اور انسانوں میں بلحاظ عقائد کے صرف مسلم اور غیر مسلم تقسیم ہو۔ کوئی تیسرا گروہ نہ ہو جو اسلامی عصبیت کو دوسرے درجہ پر سمجھے۔ اور اپنے فرقہ کو نفس اسلام سے زیادہ اہم قرار دے۔

ان آیات میں انسانی نفسیات بیان فرمائی ہیں۔ کہ کیونکر وہ حالات کے عدم توازن سے اپنے دماغی توازن کو کھو بیٹھتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ یہ سب انقلابات اللہ کی طرف سے ہیں۔ اور ناگریز ہیں۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے۔ تو پھر خلوص قلب کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکتا ہے اور رو رو کر دعائیں مانگتا ہے اور اللہ کی رحمت وشفقت سے دوچار ہوتا ہے۔ تو پھر اللہ کے ساتھ اپنی کوششوں اور نتائج کو شریک ..... ٹھہرالیتا ہے۔ حالانکہ یہ کفر ہے۔ اور اس کیلئے کوئی دلیل نہیں۔ پھر زندگی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسرت میں یہ انسان بہت خوش ہوتا ہے۔ اور تکلیف میں جو سراسر ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مایوس ہوجاتا ہے۔

حالانکہ نہ مسرت میں آپے سے باہر ہونیکی ضرورت ہے۔ اور نہ تکلیف میں مایوس ہونے کی حاجت، رزق کی کشائش اور آسودگی یکسر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس شخص کو جب چاہتا ہے دولت سے نواز دیتا ہے! اور جب چاہتا ہے۔ بڑوں بڑوں کو افلاس اور عسرت کی زندگی پر مجبور کردیتا ہے۔ اس لئے مرد مومن کا فرض ہے کہ وہ حالات کی مساعدت اور ناموافقت سے بالکل بے نیاز ہوجائے اور ہر حالت میں اللہ کا شاکر رہے۔

سودخواروں کی دولت

سودخوار قوم کے لئے اس لئے باعث لعنت ہوتے ہیں۔ کہ اُنکی دولت اور ثروتِ ملّی ضروریات میں صَرف نہیں ہوتی وہ دن رات مال جمع کرنے کی فکر میں غلطان پیچان رہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ رقم جو ہم خیرات اور صدقات کے نام سے دینگے۔ بالکل ضائع جائیگی۔ کیوں نہ یہی رقم سُود میں لگا دیجائے۔ تاکہ مزید نفع ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ بدبختو! تم اس حقیقت کو سمجھتے کہ چاندی اور سونے کے ان ڈھیروں سے کیا فائدہ جو سفر آخرت میں تمہارے کام نہ آسکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہاری دولت جس طرح دنیا کے کاموں کو سنوارتی ہے اسی طرح عقبےٰ کے کام بھی سنوارے۔ اور تمہارے لئے موجب خیر وبرکت ہو۔ اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم اپنے مال ودولت کے ذخیروں سے قوم کے غریبوں اور مسکینوں کو فائدہ پہنچاؤ۔ درحقیقت دولت کا یہی حصہ جو تم خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہو محفوظ رہتا ہے اور بڑھتا ہے۔ یہی تمہارے لئے ثواب واجر کا باعث ہے۔ اور وہ جو نیکوں میں جمع ہے۔ اور جس سے تمہیں بہت آمدنی ہوتی ہے محض ضائع جاتا ہے۔ تمہارے مرجانے کے بعد تمہیں اس سارے ذخیرۂ سیم وزر میں سے ذرہ برابر نفع نہیں پہنچے گا۔ بلکہ اور موجب عذاب ہوگا۔

عہد جدید کا داعی

اس کا کردار وخصوصیات

قرآن کی روشنی میں

داعی کے لئے وقت کے چیلنج کی نوعیت کا فہم ہونا ضروری ہے

داعی کے لئے اس دور کی اس اہم حقیقت کا فہم ہونا ضروری ہے کہ ماضی میں امت میں جو فتنے پیدا ہوتے رہے ہیں، وہ عام طور پر مقامی نوعیت کے فتنے ہوتے تھے، وہ اثرات کے اعتبار سے اپنے ہمہ گیر نہیں ہوتے تھے، ان کا مقابلہ کرنا آسان تھا، لیکن اس دور کا سب سے بڑا فتنہ جو ہمہ گیر نوعیت کا فتنہ ہے اور جس فتنہ کی پشت پناہی کفر کی ساری قوتیں اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ کررہی ہیں، وہ فتنہ سیکولرزم اور لادینیت کا فتنہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اب عالمی سطح سے لے کی قوموں کی سطح تک جو جنگ جاری ہے، وہ دین اور لادینیت کی جنگ ہے، وہ اسلام کے بنیادی عقائد کے قائم رہنے یا نہ رہنے کی جنگ ہے، عالمی کفر نے جو نظریات تخلیق دیئے ہیں اور جس تہذیب وتمدن کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کی تشکیل کی ہے اور ان تہذیبی بنیادوں کو اپنی طاقت کے جبر سے سارے انسانوں سمیت مسلمانوں پر بھی مسلط کیا ہے۔ وہ تہذیبی بنیادیں یہیں ہیں کہ ساری انسانی سوسائٹی کا اجتماعی عملی نظام، معاشرت ومعیشت وغیرہ میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔ مذہب کا دائرہ کار انفرادی زندگی میں پوجاپاٹ کی حد تک محدود ہوگا۔

جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں پرانے فقہی، کلامی مسائل اور تشریح اسلام کے حوالے سے جو اختلافات موجو رہے ہیں، موجودہ عالمی کفر کے تخلیق کردہ نظریات اور ان کی سازشوں کے پس منظر میں وہ سب ثانوی اہمیت کے حامل ہوگے ہیں، اب مسلمانوں کا سب سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان کی نسلیں دین کے بنیادی عقائد پر قائم رہیں یا ان عقائد کی انکاری ہوجائے، وہ اسلامی تہذیب کو صحیح تہذیب سمجھے یا مغربی تہذیب پر فدا ہوکر اس تہذیب میں پوری طرح رنگ جائے۔

مسلم امت کو یہ وہ خطرناک چیلنج درپیش ہے جو تاریخ میں پہلی بار پیش آیا ہے، اس لئے داعی کو اس چیلنج کی سنگینی کو سمجھکر دعوتی کام کے حوالے سے اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ہمارے ہاں پچھلے پچاس سال میں دعوت کے نام پر مختلف تحریکیں ایسی ابھری ہیں، جنہوں نے فلاں کافر فلاں کافر کے نعرے کی بنیاد پر افراد کی تربیت کی اور بعض تحریکوں نے مسلمان حکمرانوں اور ریاست کے سارے اداروں سے وابستہ افسراں اور سرکاری عملہ کو عالمی کفر کا آلہ کار سمجھکر ان کے خلاف جہاد وقتال کا کام شروع کیا، یہ سارا کام خلافتِ اسلامی اور حکومت اسلامی کے قیام کے نام پر شروع کیا گیا۔

یہ ساری تحریکیں اور اس کام کے علمبرداروں کو قریب سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں دردمندی، اسلام کی مظلومیت کے احساس اور دین سے وابستگی کے گہرے اجزاء موجود رہے ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں یہ ساری تحریکیں اس دور کی ایک اہم اور بنیادی حقیقت کے فہم سے قاصر ہیں اور وہ عالمی کفر کے پھیلائے ہونے اس جال میں پھنس گئی کہ مسلمانوں کو باہم دگر دست وگریباں کرکے، ان کی قوت کو مفلوج کیا جائے، اس طرح ان پر اپنے نظریات اور اپنی تہذیب کو پوری طرح مسلط کرنے کے لئے فضا ہموار کی جائے۔

نئے عالمی نظام میں مسلمان حکمرانوں کی حیثیت کا طفیلی نوعیت کا ہونا

نیا عالمی نظام جو تشکیل ہوا ہے، اس میں مسلمان ملکوں کے حکمرانوں کی حیثیت ضلعی حکومتوں سے زیادہ نہیں ہے، یعنی اس نظام میں پالیسی سازی کے سارے فیصلہ کن اختیارات عالمی سرمایہ دار کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں، ہمارے حکمران پاکستان اور مصر وغیرہ میں جو کچھ کررہے ہیں، وہ عالمی نظام کے حکمرانوں کے آلہ کار کی حیثیت سے کررہے ہیں۔ وہ اگر یہ نہ کریں تو وہ چل ہی نہیں سکتے۔ ان کی جگہ دوسرا جو گروہ بھی برسراقتدار آئے گا، وہ یہی کچھ کرنے پر مجبور ہوگا۔ اس لئے کہ ہماری اقتصادیات، ہماری

معیشت، ہماری تعلیم وغیرہ کا سارا نظام عالمی شاہوکار کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔

اس عالمی نظام کی گرفت کو کمزور کرنے، بلکہ اس نظام کو توڑنے کے لئے معاشرہ کی سطح پر یعنی ریاستی سطح پر ایمان وعقائد اور اخلاقی وروحانی نصب العینی کی بنیاد پر تحریکوں کو مستحکم کرنا ہوگا۔ یہ تحریکیں صحیح خطوط پر اسلامی دعوت کے کام کے ذریعہ ہی مستحکم ہوسکتی ہیں۔ اس کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں۔ دعوت کا یہ کام حقیقی داعی ہی کرسکتا ہے۔ اس لئے داعی کی تیاری کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دینا ہوگی۔

داعی کی کچھ اہم صفات

ایک نظر میں

داعی کی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں، جو دعوت کا حصہ ہوتی ہیں۔ اور وہ انہیں خصوصیات سے ہی پہنچانا جاتا ہے۔ایک یہ کہ وہ جزیرہ میں نہیں رہتا، بلکہ وہ لوگوں سے مل جل کر رہتا ہے۔ ہر قسم کے افراد سے اس کے روابط رہتے ہیں۔ لوگ ان سے استفادہ کے لئے آتے رہتے ہیں۔ وہ انہیں اپنی روحانیت اور اپنی ایمانی حرارت سے فیضاب کرتا رہتا ہے۔

داعی کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے تزکیہ وتربیت اور اصلاح اعمال کے لئے فکر مند ہوتا ہے اور لوگوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتا ہے، وہ فروعی وجزوی مسائل سے صرف نظر کرتا ہے۔

داعی کی تیسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مدعزو سے استدلال اور سلیقہ سے گفتگو کرکے دین کے حوالے سے اس کے اشکالات دور کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ اپنے دور کے افراد کی علمی وذہنی سطح کو پیش نظر رکھکر، وہ ان کی علمی وفکری رہنمائی کرتا ہے، اس سلسلہ میں قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دور کے علوم سے بھی مدد لیتا ہے۔

داعی کی چوتھی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی اپنی کوئی جماعت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی وہ امت میں اپنی نئی جماعت بنانے کی آرزو رکھتا ہے، اس لئے کہ جماعت بن جانے کے بعد اس کے حلقہ سے وابستہ افراد کو جماعتی عصبیت سے بچا کر امت پن کی طرف لانا دشوار ہوتا ہے۔ داعی کی اصل جماعت مسلم امت ہوتی ہے، اور وہ امت میں موجود تفریق کو ختم کرکے وحدت امت کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

داعی اپنے دعوتی کام کے لئے حلقہ ضرور بناتا ہے، لیکن اس کا یہ حلقہ امت کا حصہ ہوتا ہے، وہ امت سے جداگانہ نوعیت کی چیز نہیں ہوتا، اس چیز کا وہ خصوصی اہتمام کرتا ہے۔

داعی کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ لکیر کا فقیر نہیں ہوتا اور مسائل ومعاملات پر گہری نگاہ رکھتا ہے، وہ اپنے دور کے علمی، فکری، نظریاتی اور عملی نوعیت کے فتنوں ونظریات اور دعوتوں سے پوری طرح آشنا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ بہتر علمی اسلوب سے لوگوں کو وقت کے فتنوں سے بچانے کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔

داعی کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس دربان اور پہرہ دار نہیں ہوتے، اس لئے کہ وہ اپنی شخصیت کو دعوتی کام اور لوگوں کی اصلاح کے کام کے ساتھ اس طرح مستغرق کرچکا ہوتا ہے کہ اس کی اپنی جداگانہ ہستی باقی نہیں رہتی۔

اسی ضمن میں داعی کی یہ خوبی بھی سامنے آتی ہے کہ کہ وہ افراد اور اپنے درمیاں فاصلہ باقی نہیں رکھتا۔

داعی اپنے کام کے لئے چندہ نہیں کرتا اور نہ ہی لوگوں سے مالی تعاون کی اپیل کرتا ہے۔ دعوتی کام میں استغراق اور اخلاص کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کے لئے ضروری وسائل کا خود ہی انتظام کرتا رہتا ہے، اسے اپنے کام کے لئے مالی وسائل کی فکرمندی لاحق نہیں ہوتی، داعی اپنی زندگی کو سادہ رکھتا ہے، اس کی معاشرت درمیانی طبقہ کے افراد سے زیادہ بلند نہیں ہوتی، وہ طرز زندگی، طرز معاشرت میں سرمایہ داروں ومالداروں سے مشابہت اختیار نہیں کرتا، اس لئے کہ اس سے ایک تو عام افراد اور اس کے درمیاں حجابات پیدا ہوجاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے بلند معیار زندگی کی وجہ سے لوگ احساس کمتری واحساس محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ داعی اس معاملہ میں حساس ہوتا ہے اور سادہ طرز زندگی اس کا وظیفہ حیات ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے عام افراد سے داعی کے قربت کے تعلقات مجروح ہوجاتے ہیں۔

داعی کی سب سے زیادہ کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ لوگوں کو **الست بربکم قالو**

بلیٰ' والے عہد کی یاددہانی کراکے، انہیں اللہ سے والہانہ محبت کی راہ پر چلایا جائے، تاکہ ان کے سارے جذبات حسن کی تشفی وتسکین کی صورت پیدا ہو سکے۔

داعی کی یہ اور اس طرح کی خصوصیات ایسی ہیں، جو ہمیشہ اسلاف میں موجود رہی ہیں۔ اس دور میں ان خصوصیات کے حامل داعیوں کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ معاشرہ میں غلط دعوتیں اور باطل دعوتیں فروغ پذیر ہیں۔ بالخصوص جدید تعلیم یافتہ افراد ان غلط اور باطل تحریکوں کے زبردست اثرات کی زد میں ہیں، مادہ پرست مغربی تہذیب اور داعش جیسی تحریکوں کے طاقتور ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ حقیقی داعی اور مذکورہ صفات کے حامل داعیوں کی تیاری کا کام رک گیا ہے، جس کی وجہ سے ہماری خالی ذہن کی حامل نسلیں غلط تحریکوں کی آماجگاہ بن چکی ہیں۔

دعوتی کا کام کی دوحیثیتیں

دعوت کا کام ایسا ہے، جس سے دین کا تسلسل وابستہ ہے اور نسلوں کا اسلام سے جڑنے کا تعلق قائم ہے، اس کام سے غفلت کے نتیجہ میں دین کے تسلسل کے بگڑنے اور معاشرہ میں لادین تحریکوں کے طاقتور ہونے کے خطرات درپیش ہیں۔

پھر دعوتی کام، حمیت دین کا بھی تقاضا ہے۔ اگر دل سے دین سے محبت وحمیت کا تعلق قائم ہوگا تو فرد، افرادِ معاشرہ کے حوالے سے اپنے حصہ کا دعوتی کام کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دعوتی کام کسی حد تک اور اپنے دائرہ کار کی حد تک کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

قرآنی نص موجود ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً . (اے اہل ایمان اپنی جانوں اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک مفسر لکھتے ہیں:

غرض یہ ہے کہ اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دین کی اہمیت سے اس درجہ آگاہ رکھنا ضروری ہے کہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں اور اس سلسلہ میں تعلیم وتربیت سے لے کر تادیب وسرزنش تک سب باتیں روا ہیں۔ (سراج البیان)

اس طرح کا دعوتی کام تو ایسا ہے، جس کے لئے بہت زیادہ علم اور حکمت اور غیر معمولی صفات کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے احساس ذمہ داری اور حمیت دین کا ہونا کافی ہے کہ اپنی اولاد کو ہر صورت میں دین حق پر قائم رکھنا ہے۔

لیکن دعوتی کام کی دوسری سب سے اہم حیثیت وہ ہے، جو علمائے ربانی اور مشائخ پر عائد ہوتی ہے کہ افراد کی تعلیم وتربیت، تزکیہ اور ذہن سازی وغیرہ کا کام ان کے حوالہ ہوتا ہے۔ علمائے ربانی اور مشائخ کے اسی کام کی اہمیت کو پیش نظر رکھکر حضورﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے علمائے (ربانی) کی حیثیت بنی اسرائیل کے انبیاء کی سی ہے۔ اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ اس کام کے لئے حقیقی داعی، مربی ومزکی میں جو خصوصیات ہونی چاہئے، جو اسلاف میں موجود رہی ہیں، ان خصوصیات کو قرآن کی روشنی میں پیش کیا جائے، تاکہ ان خصوصیات وصفات کی کمی وکوتاہی کی وجہ سے اسلامی تحریک اور دعوتی کام جن داخلی رکاوٹوں سے دوچار ہے، ان سے ازالہ کی صورت پیدا ہو سکے۔

طاغوت کے انکار کا کام داعی کے مقاصد میں شامل ہونا

داعی کے الفاظ میں یہ بات خود شامل ہے کہ وہ سب سے کٹ کر اللہ کی ذات پر کامل یقین کا حامل ہو چکا ہوتا ہے اور دعوت رجوع الی اللہ اور طاغوت سے انکار اور اس کی نفی کا کام اس کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔

ہر دور کا طاغوت چاہتا ہے کہ داعی مادہ پرستی اور نفس پرستی کی بنیاد پر ہمارے بنے ہوئے زندگی کے عملی نقوش وخطوط کی مخالفت کرکے، اللہ کی عبادت وحاکمیت کی دعوت نہ دے بلکہ وہ خود عبادت میں مصروف ہو اور اللہ اللہ کرتا رہے لیکن باطل کی مخالفت نہ کرے اور لوگوں کو اللہ واحد کی عبادت اور دین حق کی طرف بلانے کا کام نہ کرے۔ لیکن چونکہ داعی کی یہ منصبی ذمہ داری ہوتی ہے، اس لئے داعی کا باطل سے کشمکش کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ قرآن، انبیاء کرام کی اپنے دور کے مالداروں، سرمایہ داروں وسرداروں سے اس کشمکش کا بار بار ذکر کرتا ہے، قرآن میں اس سلسلہ کی دسیوں آیتیں موجود ہیں۔

ایک آیت کی تفسیر میں فاضل مفسر لکھتے ہیں۔

حضورﷺ نے جب اپنی بعثت کا اعلان کیا تو حسب دستور جن لوگوں نے انکار کیا،

وہ مفلس اور قلاش لوگ نہ تھے بلکہ وہ لوگ تھے، جو صاحب مال ومتاع تھے اور ابتلاء سے یہ سنت چلی آرہی ہے کہ حق وصداقت کی مخالفت میں یہی رؤسا کا طبقہ پیش پیش رہتا ہے اور اس کی وجہ غالبا یہ ہے کہ غرباء کا دین سے کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ انکی آرزوئیں اور خواہشیں نہایت محدود اور ادنیٰ قسم کی ہوتی ہیں۔ مگر یہ اکابر سیادت وقیادت کے خواہاں اور منصب وجاہ کے متوالے ہوتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ قانون واخلاق کی کوئی پابندی ان پر عائد نہ ہو، مذہب کی پہلی لڑائی انہیں اغراض کی اصلاح کے لئے ہوتی ہے۔ انکی ریاست چھن جاتی ہے۔ ان کی قیادت باقی نہیں رہتی۔ دولت وثروت بھی خطرے میں میں پڑجاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مذہب قانون واخلاق کی مساوات کی بناء پر ان کی خواہشات نفس کی تکمیل نہیں ہونے دیتا اور مطالبہ کرتا ہے کہ انسانی خون اور انسانی حرمت واعزاز کے سلسلہ میں بڑے چھوٹے اور امیر وغریب کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا جائے۔

پھر اس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی تربیت کے لئے ان غریبوں کو چن لیتا ہے، جن کو یہ لوگ حقیر وذلیل جانتے ہیں۔ اور پھر ان کی روحانیتوں کو اتنا مجلی کردیتا ہے کہ یہ ان لوگوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ اگر یہ ارباب تنعم آپکے پیغام کو نہیں مانتے اور آپ کی راہ میں مشکلات کا ایک پہاڑ حائل کرنا چاہتے ہیں تو پرواہ نہ کریں۔ ان کو پسند ہے، مہلت دیں۔ اسکے بعد ان کو ہمارے پاس پابجولاں کشاں کشاں آنا ہے۔ انکے لئے جہنم ہے اور ایسا کھانا ہے جو گلے میں پھنس کر رہ جائے۔ جہاں آگ ہے تپش ہے۔ اور عذاب الیم ہے۔ فرمایا۔ کہ ان لوگوں کو اس دنیائے دوں پر ناز ہے۔ اور یہ اُس زندگی کو بھول گئے ہیں۔ (سراج البیان)

داعی کی پانچ اہم خصوصیات

سورہ مدثر میں داعی اور مبلغ کی صفات کی طرف اشارہ ہے۔

(۱) **وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ** ۔ توحید اس کے دل میں راسخ ہو اور اللہ کی ذات اور اس کی عظمت ہر چیز پر غالب ہو۔

(۲) **وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ**۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ ثیاب سے یہاں مراد اخلاق حسنہ واوصاف حمیدہ ہے۔

(۳) **وَالرُّجْزَ فَاهْجُر** ۔ ہر قسم کے دینی، علمی، عملی اور اخلاقی شبہات واشکالات سے محفوظ ہو۔

(۴) **وَلَا تَمْنُنْ** ۔یعنی جن کو دعوت دے رہا ہے، ان پر کوئی احسان نہ جتائے۔

(۵) **وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ** ۔ داعی کو اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں، ان پر صبر کرے اور حوصلہ وہمت سے ان کو برداشت کرے۔

باقی داعی کو علم ہونا بھی ضروری ہے اور اپنے دور کے حالات اور لوگوں کی ذہنی سطح کا ادراک بھی ہونا چاہے، لیکن یہ صفات وخصوصیات ایسی ہیں، جو بنیادی ہیں اور جو داعی کی شخصیت میں غیر معمولی تاثیر پیدا کردیتی ہیں اس کے کردار اور گفتگو میں وہ خوشبو پیدا کردیتی ہیں کہ یہ خوشبو افراد کو ازخود متاثر کرتی رہتی ہے۔ دعوت کے کام کے ساتھ ان صفات کا ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر دعوتی کام کے وہ نتائج نہیں سکتے، جو نکلنے چاہئے اور نہ ہی دعوتی فریضہ بخوبی سرانجام ہوسکتا ہے، اس لئے کہ مذکورہ اوصاف کے بغیر باطن فساد سے بھرا ہوا ہوگا یا باطن میں فساد کے اجزاء غالب ہوں گے۔ دعوتی کام یا دعوتی نوعیت کی گفتگو کے ذریعہ باطن میں موجود اس فساد کے اثرات ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

قرآن نے مذکورہ آیات میں داعی کی جو صفات بیان کی ہیں، ان صفات کو داعی ودعوت کے کام سے کسی صورت میں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ سچا صوفی بھی داعی ہی ہوتا ہے، اگر اس کے دل میں اللہ کی عظمت غالب نہیں، اور حب جاہ ومال کے اثرات موجود ہیں اور اس کا باطن پوری طرح پاک نہیں ہے تو اس کے باطن سے نکلے ہوئے اعمال اور ان کے اثرات طالبوں کی بہتر تربیت میں کردار ادا نہیں کر سکتے۔

یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک تو داعی کے مقام پر فائز ہوکر دعوت کا کام ہاتھ میں لینا ہے۔ دوسرے دعوت کے کام کو جزوی طور پر ضرورت کے تحت کرنا ہے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ داعی کے مقام پر فائز ہوکر، اس کام کو سرانجام دینے کے لئے مذکورہ اوصاف کا ہونا ازحد ضروری ہے، اگر یہ اوصاف کامل طور پر نہ سہی، قابل ذکر حد تک ہوں گے تو بھی دعوت کا کام سلیقہ سے ہوتا رہے گا، دوسری صورت میں دعوت کے کام سے

خیر و برکت رخصت ہوگی اور فوائد کے ساتھ ساتھ نقصانات ومفاسد کے خطرات زیادہ ہیں۔

دعوت کا کام لوگوں کے دلوں پر دستک دینا ہے

دعوت کے کام کا بیشتر تعلق لوگوں کے دلوں پر دستک دے کر، ان کی دل کی گرہوں کو کھولنے سے ہے، اس لئے کہ ہر فرد کے دل میں فطری طور پر اللہ سے محبت کے اجزاء موجود ہیں، جسے غلط تعلیم اور مادہ پرستی کا ماحول دبا دیتا ہے اور اس محبت کو غلط رخ دے کر، دلوں کو دوسری چیزوں کی محبت کے جذبات سے سرشار کر دیتا ہے۔

قرآن نے انسانی فطرت کو پیش نظر رکھکر ہی داعی کے لئے ان صفات کو ضروری قرار دیا ہے۔

توحید میں رسوخ کے بغیر دعوت کا کام نہیں ہوسکتا

پہلی چیز دل میں توحید کا رسوخ اور اللہ کی شان عظمت کا غلبہ ہے، دراصل توحید نام ہے اللہ کی محبت کو دوسری ساری محبتوں پر غالب کرنے کا، اور اللہ کے علاوہ مادی قوتوں سے کسی بھی طور پر خوف زدہ نہ ہونے کا۔ عقیدہ توحید سے فرد، اللہ کی ذات پر یقین سے سرشار ہوجاتا ہے، اس لئے توحید میں ثبات ورسوخ کے بغیر داعی کے دعوت کے کام میں پیش قدمی نہیں ہوسکتی۔

اخلاق حسنہ، دلوں کو ہموار کرنے کا ذریعہ ہے

دوسری چیز اخلاق حسنہ واوصاف حمیدہ ہیں، اخلاق حسنہ ایسی چیز ہے، جو داعی کے لئے لوگوں کے دلوں میں از خود مقام بنانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اخلاق حسنہ کا حامل داعی مسلسل کام کے نتیجہ میں بالآخر ایک دن لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے اور دعوت کے لئے دلوں کو ہموار کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اگر غیر معمولی قساوت قلبی کی وجہ سے بظاہر کامیاب نہ بھی ہو تو وہ توحید کو بہت بہتر اور سلیقہ سے پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، اس طرح وہ اپنے بنیادی فریضہ کی سرانجامی میں کامیاب ہوتا ہے۔

قلب سلیم کے حامل داعی کا یقین کے بلند مقام پر فائز ہونا

تیسری چیز کا تعلق داعی کی اسلام پر کامل یقین کی قوت سے ہے، دل کا یہ یقین اسے ہر طرح کے شبہات واشکالات سے بلند کرتا ہے۔ قلب سلیم کا حامل داعی یقین کی اس حالت پر فائز ہوتا ہے، جہاں شکوک وشبہات تو دور کی بات ہے، اس کے دل وذہن میں اللہ ورسول کی تعلیمات کی صداقت کے لئے ایسے ایسے قیمتی علمی وفکری نکات سامنے آتے رہتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، نیز وہ اللہ سے اپنی محبت اور دینی جذبات سے سرشاری کی وجہ سے دینی واخلاقی طور پر بھی مستحکم سے مستحکم تر ہوتا جاتا ہے۔

داعی، لوگوں سے اجر وصلہ کا متمنی نہیں ہوتا

مدعو پر دعوتی کام کا احسان نہ جتانا، یہ داعی کی خصوصیات میں شامل ہے۔

داعی لوگوں کے صلہ واجر سے بے نیازی، اخلاص، للھیت، بے نفسی اور محض اللہ کی رضامندی کے جذبہ سے اس طرح سرشار ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی پسند وناپسند سے بلند ہوجاتا ہے۔ اس پر محض اللہ کی رضامندی کی فکر غالب ہوتی ہے، وہ لوگوں سے اپنے کام کے اجر وصلہ کا ہرگز متمنی نہیں ہوتا، لوگوں کی دولت اور مال پر اس کی نظر ہرگز نہیں ہوتی، اس کی دعوت کو کوئی قبول کرتا ہے یا نہیں، وہ اس فکر سے بھی بلند ہوتا ہے، البتہ وہ لوگوں کی اصلاح کے لئے حریص ضرور ہوتا ہے، تاکہ اللہ کی مخلوق اپنے حقیقی خالق کی معرفت کی راہ پر گامزن ہوکر سعادت دارین سے بہرہ ور ہو۔

بعض اوقات داعی کو اپنی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں لوگوں کی طرف سے بے نیازی اور سرکشی کی روش اسے رنجیدہ کردیتی ہے، لیکن یہ رنجیدگی ایک طرح سے فطری نوعیت کی ہے، یہ رنجیدگی اسے یاس کی طرف لے جانے کی بجائے اپنے دعوتی کام کو مزید موثر طور پر سرانجام دینے کا حوصلہ پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

داعی کی استقامت سے اس کے لئے حالات کا سازگار ہونا

پانچویں چیز دعوت کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے۔ داعی اپنے مولا سے مستحکم تعلق اور روزانہ عبادت وذکر وفکر کے ذریعہ اس سے راز ونیاز کی وجہ سے ایمان کی بہت مضبوط حالت میں رہتا ہے۔ ایمان کی یہ حالت اسے ہر طرح کے حالات میں (وہ چاہے مخالف حالات ہوں یا سازگار) حوصلہ سے دعوتی کام جاری رکھنے کا داعیہ پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس حوصلہ وجذبہ اور مستقل مزاجی سے مشکل

حالات میں کام کرتے رہنے کے نتیجہ میں بالآخر داعی کے لئے حالات سازگار کردیئے جاتے ہیں اور اسے معاشرہ میں دعوت کو قبول کرنے کا ایک مؤثر حلقہ عطا کردیا جاتا ہے۔

داعی ومدعو کے درمیاں بے غرضانہ محبت کے رشتہ کا قائم ہونا

دعوت کے کام کی اگر مزید تشریح کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام علمی، وذہنی سطح سے آگے بڑھکر، پاکیزہ روحانی واخلاقی سطح کو بلند کرنے سے متعلق ہے، جس سے داعی ومدعو کے درمیاں بے غرضانہ محبت کا رشتہ مستحکم ہو، داعی، مدعو کو جہنم کی آگ سے بچانے اور اسے انسانی اوصاف سے بہرہ ور کرنے کے لئے غیرمعمولی طور پر مضطرب ہو، نیز وہ مدعو سے کسی بھی طرح کے مادی مفادات وابستہ کرنے سے بلند ہو۔

اس طرح داعی کے دل کے پاکیزہ جذبات ہی فرد وافراد کے قلوب کو متاثر کرکے، ان میں حقیقی تبدیلی پیدا کرنے کا موجب بن سکتے ہیں۔

دوسری صورت میں دعوت وتزکیہ وتربیت کے نام پر ہونے والے کام سے ایک تو امت میں تقسیم کا عمل بڑھتا رہے گا، دوسرے یہ کہ دعوت اور بزرگی کے نام پر نئے نئے سرمایہ دار پیدا ہوتے رہیں گے، جو شان ومان کی حامل گاڑیوں میں گھومنے اور بنگلوں میں رہنے کی آرزوں کے حامل ہوں گے۔

یہ چیز ایسی ہے، جو لوگوں کو دعوت وتربیت وتزکیہ کے کام سے مزید دور کرنے کا موجب ثابت ہوگی۔

داعی کی شخصیت کا شفقت اور کریمانہ اخلاق کا حامل ہونا

داعی کی ایک بڑی خصوصیت اس کے کریمانہ اخلاق ہوتے ہیں، معافی رحم اور شفقت کی ادائیں ہوتی ہیں۔ اپنوں اور غیروں سب کے لئے اس کی دل دل میں وسعت موجود ہوتی ہے۔

داعی، دل کی وسعت وبلندی کے معاملہ میں اس مقام پر فائز ہوتا ہے، جہاں مادی انسان کے لئے تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ داعی کی یہ مزاجی خصوصیت ایسی ہوتی ہے، جس میں وہ سب سے منفرد اور مثالی ہوتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے ساتھ جو زیادتی کی کہ انہیں مارنے تک کا سوچا، کنویں میں ڈال کر چلے گئے۔

لیکن جب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے اور معافی چاہی تو آپ نے فرمایا **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ** . (آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے)۔

خود حضورﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر اپنے مخالفین بلکہ اپنی جان کے دشمنوں کے ساتھ عام معافی کا جو معاملہ فرمایا، وہ ایسا ہے جو رہتی دنیا تک داعی کی عظیمت کردار کی یاد دہانی کراتا رہے گا۔

کریمانہ اخلاق اور شفقت ورحم کے انبیاء کرام کے یہ واقعات داعی کو یہ سبق دلاتے ہیں کہ اس معاملہ میں اتنی بلندی پر پہنچنا تو اس کے لئے مشکل ہے، تاہم داعی کی زندگی میں اس کردار کے قابل ذکر اجزاء کا ہونا ضروری ہے۔

حضرت نظام الدین اولیا نے صوفی (جو داعی ومزکی بھی ہوتا ہے) اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ صوفی کی جان اور اس کا مال مباح ہے۔ یعنی داعی، دعوت کے کام اور مخلوق کی بھلائی وبہتری کی فکر میں اس قدر مستغرق ہوتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں اپنی جان ومال سے بھی دستبردار ہوجاتا ہے۔ اس کی نظر میں اس کا مال اس کا نہیں، اللہ کی غریب مخلوق کا مال ہوتا ہے۔ وہ اس کے مال کو استعمال کر سکتے ہیں، اس طرح اس کی جان اس کی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی جان ومال کو اللہ کے ہاتھوں بیچ چکا ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی اسے نقصان پہنچاتا ہے تو وہ بدلہ لینے کی فکر میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایسے افراد کو دل سے معاف کردیتا ہے، حضورﷺ کے واقعات اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بیان کردہ واقعہ سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔

داعی کا اپنی شخصیت پر صبغۃ اللہ کو غالب کرنا

داعی قول وعمل میں تضاد سے پاک ہوتا ہے، اس کی دل وزبان میں یکسانیت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو جن باتوں کی طرف دعوت دیتا ہے، ان باتوں پر وہ خود سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عامل ہوتا ہے اور وہ اعمال ان کی زندگی کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں داعی اس کام پر فائز ہونے سے پہلے نفس کو پوری طرح مہذب بنانے

اور اللہ ورسول کی اطاعت کا خوگر بنانے اور اپنی شخصیت پر صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) کو غالب کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا ہوتا ہے۔

داعی کی نیت، اور اس کی پاکیزہ عملی زندگی، اس کی گفتگو اور باتوں سے زیادہ روشن ہوتی ہے، بلکہ اس کی باتوں میں اس کے اندر کی روشنی صاف طور پر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً. (گفتار کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا کون ہوسکتا ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور عمل صالح کرتا رہا)۔ یعنی اللہ کی طرف بلانے والے کی عملی زندگی خود پاکیزگی اور اعمال صالحہ کا کامل نمونہ ہوتی ہے۔

داعی کا حکمتہ وموعظتہ حسنہ سے کام لینا

داعی کو مختلف سطحوں پر کام کرنا ہوتا ہے، عام لوگوں میں دعوت کام، ذہنی وعلمی اعتبار سے زیادہ سطح کے لوگوں میں کام، معاشی ومعاشرتی اعتبار سے بلند سطح کے حامل افراد میں کام۔

عام افراد میں کام کے لئے ان کی فطرت میں موجود توحید کے داعیہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے سامنے سادہ الفاظ میں توحید کی دعوت دینی ہوتی ہے اور اللہ کی عبادت کی طرف بلانا ہوتا ہے۔ جب کہ زیادہ علمی سطح کے افراد جو عقلیت کے زیادہ استعمال کے وجہ سے شکوک وشبہات کا شکار ہوتے ہیں، ان سے زیادہ بہتر علمی واستدلالی انداز سے مباحثہ کرنا ہوتا ہے۔

اس طرح کے لوگوں میں جن کی فطرت سلیمہ کے کچھ نہ کچھ اجزاء محفوظ ہوتے ہیں، وہ مؤثر دلائل سے متاثر ہوکر دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ ایک گروہ اختیار واقتدار کے صاحبان کا گروہ ہوتا ہے، جو اقتدار کے غرور میں فطرت سلیمہ کو مسخ کر چکا ہوتا ہے اس سطح کے افراد کے سامنے گفتگو کے لئے قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو بیان فرمائی ہے۔

ابتدائی دوگروہوں کے سامنے دعوت کے اسلوب کے لئے قرآن کی درج ذیل آیت اہمیت کی حامل ہے۔

ادْعُ إِلِى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ. (سورہ نحل آیت ۲۵) (اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بحث کرو)۔

اس آیت میں داعی کی حکمت وموعظتہ حسنہ کی دو بنیادی صفتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

حکمت وموعظتہ سے مراد دانائی، قلبی بصیرت، دل نشین ومؤثر اسلوب بیان، دل کی ساری گہرائیوں سے مدعو کی دل کی گرہوں کو کھولنے کے کوشش کا ہونا، بہتر استدلال، موقعہ ومحل کے مناسبت سے دعوت کی بات پیش کرنا، مدعو کو اشتعال اور ردعمل کی نفسیات میں لائے بغیر محبت آمیز انداز سے اس سے گفتگو کرنا، حکمت وموعظتہ حسنہ میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔

داعی میں نرمی کی صفت کا ہونا

قرآن نے داعی کے لئے نرمی کی صفت کا بھی خصوصی ذکر فرمایا ہے، مدعو چاہے بڑی سطح کی شخصیت ہو یا عام فرد، سب کو اللہ کی طرف بلاتے وقت نرمی کی صفت کا ہونا ضروری ہے۔

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں فرمایا گیا ہے۔

اذْهَبَا إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُ قَوْلاً لَّيِّناً لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى. (طہٰ آیت ۴۴) (تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے سر اٹھا رکھا ہے سو اس سے نرمی سے بات کرو شاید وہ سوچے یا ڈرے)۔

اس کی تفسیر میں ایک مفسر لکھتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے کہ جب کبر وغرور کے اس مجسمہ کے پاس جاؤ، جس کا نام فرعون ہے تو نہایت رفق وملاطفت سے پیش آنا، حلاوت وشیرینی سے باتیں کرنا، تاکہ اس کے دل میں اثر پیدا ہو سکے اور اس کی قساوت قلبی پر خشیت الٰہی غالب ہوجائے۔

یہاں ذرا ملاحظہ کیجئے کہ فرعون کے مقابلہ میں جو ظالم ہے، جابر ہے اور بدرجہ اتم سرکش ہے، اپنے پیغمبر کو اخوت وملاطفت کی تلقین کی جارہی ہے، سوچئے اور بتایئے، ہمارے علماء اور قدسیان طریقت کا رویہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کیا ایسا ہی ہے، وہ مسلمان جو کلمہ گو ہیں، خدا کو ایک مانتے ہیں اور فروتنی وانکسار سے رہنا اپنا فخر جانتے ہیں، اس کی ادنیٰ کوتاہیوں اور لغزشوں پر ہمارے علماء ومرشدین کس خشونت اور درشتی سے پیش

آتے ہیں۔ (تفسیر سراج البیان صفحہ ۷۵۰، مولانا محمد حنیف ندوی)

دعوتی کام کے لئے قرآن کے بیان کردہ ان مذکورہ اوصاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات پر یقین کی قوت سے سرشار ہونا، اوصاف حمیدہ کا صاحب ہونا، لوگوں سے نفع ونقصان سے بے نیاز ہونا، ان سے کسی صلہ کی توقع نہ رکھنا وغیرہ یہ اوصاف ایسے ہیں، جس کے بغیر حقیقی داعی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اگرچہ داعی کے لئے استدلال کی صلاحیت اور اظہار بیان کی استعداد بھی ضروری ہے، جس کا ذکر قرآن کی مختلف آیتوں سے ہوتا ہے، لیکن مذکورہ صفات کلیدی نوعیت کی صفات ہیں، جس کے بغیر دعوت کا کام فرد کو قدم قدم پر اشتعال، جھنجھلاہٹ، مدعو سے تعلقات کی خرابی، بے حوصلگی اور اخلاقی مفاسد سے دوچار کردے گا، اس طرح دعوت کے نام پر چھوٹے چھوٹے گروہ منظّم ہوکر، ایک دوسرے سے صف آرا ہوں گے۔ اس طرح کے دعوتی کام اور ان کے اثرات سے بچاؤ کی کوئی صورت موجود نہیں۔ ہمارے ہاں امت میں صدیوں سے اکابر بزرگوں کی طرف سے داعی کے مقام پر انہی افراد کو فائز کیا جاتا تھا، جو تربیت وتزکیہ کے ان مقامات سے گذر کر، ان صفات کے حامل ہوتے تھے اور نفسی قوتوں کے طوفانوں سے گذر کر نفس مطمئنہ کے مقام پر آجاتے تھے۔

ذکر کا داعی کا سب سے طاقتور ہتھیار ہونا

دعوتی کام کے دوران یہ بھی ہوتا ہے کہ داعی کی ساری دلسوزی، دردمندی اور ہمدردی کے باوجود لوگ اپنی نفسی کدورتوں کی وجہ سے داعی کے خلاف ہوجاتے ہیں اور اس کے خلاف محاذ کھڑا کردیتے ہیں اور اس کی شخصیت کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں بناتے رہتے ہیں، جس سے داعی کو اذیت ہوتی ہے اور اس کا سینہ تنگ ہونے لگتا ہے۔ اس طرح کے موقعہ پر قرآن نے داعی کو تاکید کی ہے کہ وہ اپنے رب کی زیادہ سے زیادہ تسبیح بیان کرے، اس سے اس کے اذیت کے احساسات کافور ہوجائیں گے اور وہ اللہ کی ذات پر اعتماد ویقین کی کیفیات سے سرشار ہوکر نئی توانائی کے ساتھ دعوت کے کام میں مصروف ہوگا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ. (ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے پس تم اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد کرتے رہو اور سجدہ کرنے والوں میں ہو۔)

داعی کی مذکورہ خصوصیت جس کا اوپر ذکر کیا گیا، قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

اذْهَبْ أَنتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي. (تم اور تیرے بھائی میری آیتیں لے کر فرعون کے پاس جاؤ لیکن کہیں میرے ذکر سے غافل نہ ہونا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی عین دعوتی کام کے دوران متوجہ الی اللہ ہوتا ہے، اللہ کے ذکر میں مصروف ہوتا ہے، ذکر کے انوار سے سرشار ہوتا ہے، ذکر کے ذریعہ اخلاص کے بلند مقامات پر فائز ہوتا ہے اور اپنے ساتھ اللہ کی مدد ونصرت کو شامل حال رکھتا ہے۔

دعوتی کام کے دوران ذکر کی استعداد کا حاصل ہونا، یہ ذکر میں استغراق اور ذکر کے ملکہ کے استحکام ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس آیت کے تشریح میں ایک مفسر لکھتے ہیں:

فرعون کے پاس بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو جو نصیحتیں ارشاد فرمائی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ آج کل کے علما کو آب زر سے لکھ لینا چاہئے، ارشاد ہوتا ہے کہ دیکھنا میری یاد سے غافل نہ ہوجانا اور ہر وقت عبودیت ونیازمندی کے تعلقات کو قائم رکھنا، کیونکہ یہی چیز ہے، جس سے دلوں میں پاکیزگی موجود رہتی ہے اور انسان دنیا کی تمام لذتوں کو آخرت کے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے، ذکر وشغل کی برکات سے روح میں نزہت وتوانائی پیدا ہوتی ہے اور دل ودماغ مجلّے اور روشن ہوجاتے ہیں۔ یہی وہ اکسیر ہے جس کے باعث چہروں پر اور قلب میں سرور موجزن ہوتا ہے اور یہی وہ کبریت احمر ہے جس سے بہرہ ور ہونے والا انسان حقیقتاً نہایت خوش قسمت انسان ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور ہاروں علیہ السلام چونکہ ایک بہت بڑی مادی قوت سے نبرد آزما ہونے کے لئے جارہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان میں اسی تناسب سے روحانیت ہو اور فرعون کے عساکر کے مقابلہ میں اللہ کی زبردست اعانت موجود ہو۔

علماء اور راہنمایان دین کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ بھی اللہ کے اس ارشاد کو نہ بھولیں اور مقام ارشاد پر جلوہ فرما ہونے سے پہلے صالح، نیک اور خداپرست انسان بننے کی کوشش کریں۔ (سراج البیان، صفحہ ۷۵۰ مولانا محمد حنیف ندوی)

داعی کا دنیا واہل دنیا سے استغنا کے مزاج کا راسخ ہونا

داعی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اہل دنیا سے بے نیاز ومستغنی ہوتا ہے، اس کی نظروں میں دنیا کی کوئی حیثیت ووقعت نہیں ہوتی، وہ سامان دنیا سے التفات نہیں رکھتا، جب

کہ اہل دنیا، سامان دنیا پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور وہ اسی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ داعی کی ہر وقت نگاہ دوسری دنیا یعنی آخرت کی طرف لگی ہوتی ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى. (سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۱)

(اور حیاتِ دُنیا کی آرائش کے سامان میں سے جو ہم نے اُن میں سے بعض کو طرح طرح کے فوائد دیئے ہیں تم انکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، کہ اُس میں اُن کی آزمائش ہے اور تیرے رب کا رزق بہتر اور پائدار ہے)۔

اس کی تفسیر میں فاضل مفسر لکھتے ہیں: دنیا میں قسم قسم کے کافروں مثلاً یہود ونصاریٰ، مشرکین اور مجوس وغیرہ کو ہم نے عیش وتنعم کے جو سامان دیئے ہیں، ان کی طرف آپ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے (جس طرح اب تک نہیں دیکھا ہے) یہ محض چند روزہ بہار ہے، جس کے ذریعہ ہم ان کا امتحان کرتے ہیں کہ کون احسان مانتا ہے اور کون سرکشی کرتا ہے۔ جو عظیم الشان دولت حق تعالیٰ نے (اے پیغمبرؐ) آپ کے لئے مقدر کی ہے۔ مثلاً قرآن کریم، منصب رسالت، فتوحات عظیمہ، رفع ذکر، اور آخرت کے اعلیٰ ترین مقامات، اس کے سامنے ان فانی اور حقیر سامانوں کی کیا حقیقت ہے، آپ کے حصہ میں جو دولت آئی ہے، وہ ان کی دولتوں سے کہیں بہتر ہے اور بذات خود یا اپنے اثر کے اعتبار سے ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، بہرحال آپ نہ ان کی تکذیب واعراض سے مضطرب ہوں اور نہ ان کے سازوسامان اور مال ودولت کی طرف نظر التفات اٹھائیں۔ (تفسیر عثمانی صفحہ ۴۲۸۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

اس سلسلہ میں ایک اور فاضل مفسر لکھتے ہیں:

ان آیات میں حضورؐ کو صبر وبرداشت کی تلقین فرمائی ہے کہ اگر یہ بدبخت بدزبانی اور دشنام طرازی سے باز نہیں آتے۔ تو آپ ان سے اتنے بلند ہوجایئے، کہ ان کو خود اپنے بداعمال پر ندامت محسوس ہونے لگے، اللہ کی عبادت کیجئے۔ اس کی حمد وستائش کا اظہار کیجئے اور ان کے تکلفات کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھئے کہ یہ سب سامان عیش وطرب ان کے لئے وجہ آزمائش ہیں۔ سچا دوست اور باقی رہنے والا سرمایہ وہ ہے، جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ خود قیام صلوٰۃ پر عمل کیجئے۔ اور اپنے قریب کے لوگوں کو اس پر آمادہ کیجئے۔ رزق کی جانب سے بے نیاز ہوجایئے۔ ہم آپ کو دنیا کے افکار سے مستغنی کردیں گے۔ تاکہ آپ فراغ قلبی کے ساتھ اسلام کو دنیا کے کناروں تک پہنچا سکیں۔ ان سب احکام کا مقصد یہ نہیں کہ حضورؐ میں صبر وبرداشت کا مادہ نہیں تھا۔ یا تسبیح وستائش کا جذبہ نہیں تھا، یا ان کی نظر دنیا کے تکلفات پر تھی۔ یا یہ کہ آپ دولت حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔ بلکہ بات یہ ہے، کہ قرآن حکیم کا یہ مخصوص انداز بیان ہے کہ وہ حضورؐ کی سیرت کو احکام کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے حاصل ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ وہ کفار مکہ حضورﷺ کو بے حد ایذائیں پہنچاتے ہیں۔ مگر آپ ان کے مقابلہ میں ہمہ تن صبر وبرداشت ہیں۔ تسبیح وستائش رب العزت سے کام ہے۔ اور گو کفار کی نظریں محض دولت وآسائش پر ہیں۔ مگر آپ قطعاً ان تکلفات سے بالا ہیں۔ (تفسیر سراج البیان صفحہ ۷۶۷)

داعی کا اخلاص کے بلند مقام پر فائز ہونا

داعی کی ایک بڑی صفت اخلاص، للھیت وبےنفسی ہے، وہ جہاں لوگوں کی اصلاح کا حریص ہوتا ہے اور اس کے لئے بے تاب ہوتا ہے، وہاں وہ یہ سارا کام محض اللہ کی رضامندی اور اپنی دینی ودعوتی ذمہ داری کی خاطر کرتا ہے۔ اس کام کے لئے وہ نشرواشاعت وپبلسٹی کے مروجہ ذرائع اختیار کرنے سے بھی زیادہ جس چیز کا اہتمام کرتا ہے، وہ اخلاص وبےنفسی کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ اس کے کام میں وہ تاثیر وبرکت پیدا کرتا ہے اور اس کی آواز کو دور دراز مقامات تک پہنچا دیتا ہے کہ وہم وگمان سے بھی باہر۔

اس سلسلہ میں قرآن کی آیت کی تشریح میں فاضل مفسر لکھتے ہیں:

اصل بات یہ ہے کہ دل میں اخلاص ہو، باتوں میں صداقت ہو، اللہ کی جانب سے مقبولیت کی خلوت عطا ہو، تو اس کے بعد نشر واشاعت کی ضرورت نہیں، شان وشوکت کی حاجت نہیں، کہیں بیٹھ جایئے، آبادیوں سے دور اپنا مسکن بنایئے، دل کھنچے ہوئے چلے آئیں گے اور صداقت وسچائی کو قبول کریں گے۔

اور اگر سچائی کی نعمت سے آپ محروم ہیں تو پھر باوجود منظّم سامان کے، کامیابی ممکن نہیں، ہندستان کی تبلیغی تاریخ ملاحظہ فرمایئے، چند نفوس قدسیہ آکر جنگلوں میں بیٹھ گئے ہیں اور ان کی روحانیت سے دور دور تک اسلام پھیل گیا ہے۔ آج ہندستان میں جس قدر مسلمان ہیں، وہ انہیں لوگوں کی برکات کا ثمرہ ہے اور ہندستاں میں ہزار سالہ حکومت اسلامی نے وہ کام نہیں کیا، جو ان اللہ والوں نے کیا، آج جب کہ تبلیغ کے وسائل زیادہ وسیع ہیں، لوگ زیادہ قابلیت کے ساتھ اسلام کو پیش کر سکتے ہیں، تو کیوں اسلام کی ترقی کی رفتار نہایت حوصلہ شکن ہے، محض اس لئے کہ اب دعوت وتبلیغ کا ہنگامہ تو خاصہ موجود ہے، مگر اخلاص وعمل کا وہ جذبہ موجزن نہیں، زبان میں حلاوت ہے، مگر روحانی گھلاوٹ نہیں، جو ان لوگوں کا حصہ تھا۔ (تفسیر سراج البیان، صفحہ ۶۲۲ سورہ ابراہیم)

دعوتی کام میں خیروبرکت کی رخصتی کا سبب

اب جو دور آیا ہے، وہ ایسا دور ہے، جس میں داعی کی تربیت وتزکیہ کرکے، اسے ان

اوصاف وصفات کا حامل بنانے کا ہمارا نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ خانقاہوں سے خلافت یافتہ افراد ہوں یا دینی مدارس سے دس بارہ سال تک پڑھکر فارغ ہونے والے علماء کرام، ان کے اندر عام طور پر سب سے طاقتور داعیہ یہ کارفرما ہوتا ہے کہ ایسا طریقہ اختیار ہو، جس سے ہمارے ساتھ مالدار افرا وابستہ ہوں۔ یعنی لوگوں سے مالی تعاون کی صورت میں اجر وصلہ کے طاقتور جذبات ہیں، جو ان سب میں عام طور پر موجود ہیں، ان جذبات وتقاضوں کے ساتھ دعوت کے کام میں خیر وبرکت کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

داعی کا امت میں تفریق کو گوارا نہ کرنے کا کردار

داعی کے کردار کا ایک اہم پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ کلمہ گو افراد (جو مسلم امت کا حصہ ہوتے ہیں) ان کے درمیان تفریق کو برداشت نہیں کرتا، بلکہ وہ امت کے اتحاد ووحدت کے لئے کوشاں ہوتا ہے، اس لئے کہ امت اگر ایک بار گروہوں میں منقسم ہوگئی تو اس سے امت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

داعی، افراد امت کی فکری وعملی گمراہیوں کی اصلاح کے لئے ہر ممکن حد تک کوشاں ہوتا ہے، لیکن افراد امت کی اس طرح کی خرابیوں کی وجہ سے ان پر سختی وتشدد کرنے اور انہیں دائرہ امت سے خارج کرنے کا متحمل نہیں ہوتا۔

داعی، امت کے بعض گروہوں میں موجود علمی وعملی کمزوریوں پر اپنی توانائیاں خرچ کرنے کی بجائے وہ مثبت طور پر توحید، اصلاح اعمال، تقویٰ اور تزکیہ پر زور دیتا ہے اور اپنی بیشتر توانائی دل کی تبدیلی پر صرف کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں داعی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ افراد امت کے ایک حصہ کی توحید کی منافی سرگرمیاں تو برداشت کرسکتا ہے، لیکن ان میں تفریق اور گروہ بندی کو گوارا نہیں کرتا۔

اس ضمن میں قرآن نے حضرت ہارون علیہ السلام کا واقعہ پیش فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں جب بنی اسرائیل کی رہنمائی کا کام ان کے سپرد ہوا اور ایک گروہ نے گوسالہ پرستی شروع کردی تو حضرت ہارون علیہ السلام نے ان پر سختی نہیں کی۔

اس سلسلہ میں قرآن کی درج ذیل آیتوں کی تفسیر میں ایک فاضل مفسر نے بہت قیمتی بحث کی ہے جو آج کے ہم جیسے داعی نما افراد کے لئے بصیرت افروز ہے۔ **إِنِّيْ خَشِيْتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ (سورہ طہ آیت ۹۰ تا ۹۴)** میں تو اس سے ڈرا کہ آپ کہیں یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔

موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس بت پرستی کی حرکت سے سخت طیش میں تھے۔ فرط غضب میں اُنہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام سے بھی سختی کے ساتھ باز پُرس کی۔ اور کہا کہ تم نے یہ سب کچھ کیوں اپنے سامنے ہونے دیا۔ یہاں چند باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت میں فطرتاً سختی تھی۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ کیونکہ مقابلہ فرعون سے تھا۔ اور اس کی قوم کے جبارہ سے۔

(۲) یہ غضب ذاتی طور پر نہ تھا، بلکہ دین کے مقابلے میں محض اللہ کی محبت کے جوش سے تھا۔

(۳) واقعات اسی نوع کے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کا غصّہ سے بے تاب ہوجانا بالکل اضطراری تھا۔ کیونکہ اُنہوں نے بڑی مشکلوں سے بنی اسرائیل کو فرعون کے چنگل سے نکال کر یہاں رکھا تھا۔ تاکہ یہ گمراہی سے محفوظ رہیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں بھی یہ لوگ محفوظ نہیں رہے۔ اور ساری محنت اکارت گئی تو غصہ سے بھڑک اُٹھے۔

(۴) موسیٰ علیہ السلام جہاں پیغمبر تھے۔ وہاں انسان بھی تھے۔ اور بشری تقاضے ان میں موجود تھے۔

ان حقائق وحالات میں اگر اُنہوں نے ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑلی اور بظاہر غیر اولیٰ انداز میں تخاطب فرمایا تو بالکل طبعی اور قدرتی امر تھا۔

اس کے جواب میں ہارون علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ سننے کے قابل ہے کہتے ہیں۔ میں نے زیادہ زور کے ساتھ اس لئے ان کو گوسالہ پرستی سے نہیں روکا۔ کہ ان میں تفریق نہ پیدا ہوجائے۔ گویا ہارون علیہ السلام کی نظر میں اختلافات وتشتت کا مرض شرک کے مرض سے بھی زیادہ خطرناک اور ہولناک ہے۔ اُنہوں نے یہ تو گوارا کرلیا کہ ایک جماعت کی جماعت گمراہی کے عقیدے پر جمی رہے، مگر یہ گوارا نہیں کیا کہ قوم میں اختلاف پیدا ہو اور قوم دوگروہوں میں تقسیم ہوجائے، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آجانے کے بعد شرک، توحید سے بدل سکتا ہے اور قوم پھر ایک خدا کی پرستار بن سکتی ہے، مگر شاید یہ مشکل ہو کہ دوگروہوں میں بٹی ہوئی جماعت پھر مسلک وحدت میں منسلک ہو سکے۔ کیا ہمارے افتراق انگیز علماء اس حقیقت پر غور فرمائیں گے؟ (سراج البیان مولانا محمد حنیف ندوی)

سرکش مالداروں کے مقابلہ میں غریب متلاشی حق کو ترجیح دینا

داعی اگرچہ دعوت کے سلسلہ میں حریص ہوتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ مالدار اور

معاشرے کے مؤثر طبقات تک دعوت پہنچے اور وہ اسلام سے ہمہ آہنگ ہوجائیں، تاکہ ان کے زیر اثر افراد کے رجوع کی صورت پیدا ہو، اس طرح اسلامی دعوت کے لئے فضا سازگار وہموار ہو، اس لئے وہ اس امر کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور ازحد خواہشمند بھی، لیکن مالداری، سرمایہ داری، اور سرداری اپنے ساتھ تکبر وانا کے جو حجابات لاتی ہے، اس کی وجہ سے اکثر مالداروں اور اسلامی دعوت کے درمیان فاصلے پیدا ہوجاتے ہیں، ان کا دل اکثر حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، جب کہ ان کے مقابلہ میں غریب افراد جن کے دلوں میں توحید کے فطری اثرات موجود ہوتے ہیں، ان میں حق کی طلب آسانی سے پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح کے حالات میں داعی کو سرکش مالداروں سے صرف نظر کرکے حق کے متلاشی غریب افراد کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا چاہئے، اور ان کے تزکیہ کی فکر کرنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں سورہ عبس میں طالب حق نابینا اور سرکش مالداروں کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کو جو بات فرمائی گئی ہے، وہ بہت اہم ہے، ہر دور کے داعی کے لئے یہ نکتہ قابل توجہ ہے۔

غریب طالب حق کے مقابلہ میں مالداروں کی طرف زیادہ التفات، ہم جیسے داعیوں کے لئے اس اعتبار سے بھی نقصاندہ ہے کہ دل میں مالداروں سے مال کی آرزوئیں جنم لے کر طالب کو مال ودولت کی طرف کھینچنے کا سبب بنتی ہیں، موجودہ دور میں دعوت واصلاح اور تزکیہ کے نام پر بیشتر مشائخ کے ساتھ یہی ہوا ہے کہ مالداروں سے قربت کی آرزو ان پر اپنا رنگ غالب کرنے سے زیادہ ان کے رنگ میں رنگنے کا سبب بن گئی ہے۔

غریب متلاشیٔ حق کو اہمیت دینے کے سلسلہ میں سورۃ عبس کی مذکورہ آیات بہت اہم ہیں:

عَبَسَ وَتَوَلَّى أَن جَاءهُ الْأَعْمَىٰ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ. (سورہ عبس) محمد ﷺ ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے۔ کہ اُن کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔ یا سوچتا تو سمجھانا اُسے فائدہ دیتا جو پروانہیں کرتا۔ اُس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔

ایک فاضل مفسر نے اس کے بہت قیمتی تفسیری نکات بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

یہاں اس بات کو بطور اصل اور حقیقت کے ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ مقام نبوت اس سے کہیں بلند وارفع ہے کہ اس کی جانب گناہ یا معصیت کو منسوب کیا جائے۔ کیونکہ نبوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ایک سیرت ہے، جو عام انسانوں سے ممتاز اور برتر ہے اور ایک ایسا کیرکٹر ہے، جو عصمت اور عفت کے زیور سے آراستہ ہے۔ اُن سے اگر بتقاضائے بشریت لغزش کا صدور ہوتا ہے تو محض دوران اجتہاد میں، بعض اوقات یہ اولیٰ اور اولیٰ تر میں امتیاز نہیں کر پاتے اور اجتہاد کے ایسے پہلو اختیار کر لیتے ہیں، جو اولیٰ ہوتا ہے۔ مگر اولیٰ تر نہیں ہوتا اور ان کے مرتبہ ومقام کی بلندی اور رفعت کی وجہ سے اتنی سی بات بھی اللہ کو ناگوار ہوتی ہے اور اس پر ان کو تادیباً مطلع کردیا جاتا ہے۔

سورہ عبس میں بھی بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ کیونکر حضور ﷺ سے اجتہاد میں سہو ہوا اور کیونکر اللہ کی جانب سے متنبہ کیا گیا۔ بات یہ تھی کہ ایک دن صنادید قریش کا ایک گروہ جناب رسالت مآب ﷺ سے مصروف کلام تھا اور آپؐ بکمال توجہ ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ اتنے میں ابن ام مکتوم جو نابینا تھے۔ شوق اور وارفتگی کی عالم میں آئے اور آپؐ سے مسائل پوچھنے لگے اور یہ نہ دیکھ سکے کہ آپ پہلے کن لوگوں کو شرف مکالمہ بخش رہے ہیں۔ آپؐ نے اس خیال سے کہ یہ لوگ جذبہ تنفر سے کہیں نفسِ اسلام کی دعوت کو نہ ٹھکرادیں، یہ موزوں خیال کیا کہ اس وقت ان کو قدرے سختی سے روک دیا جائے اور ان سردارانِ قریش سے گفتگو کو برابر جاری رکھا جائے، شاید اس التفات اور توجہ سے ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا ہوجائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ ادا ناگوار معلوم ہوئی۔ کیونکہ یہ بات وہی علام الغیوب خوب جانتا ہے کہ نتائج کے اعتبار سے کون سے چیز بہتر تھی۔ یعنی ان قریش کے بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ بحث ومکالمہ کو جاری رکھنا یا ایک مخلص مسلمان کے ساتھ علم ورافت کے ساتھ گفتگو کرنا۔ اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔ (سراج البیان)

داعی کی اہم خصوصیت

سبیل المؤمنین کو مضبوطی سے پکڑتے رہنا

داعی، قرآن پاک واحادیث اور سیرت پاک ہی کو اپنی دعوت کی بنیاد بناتا ہے اور اجتماعی زندگی میں اصلاح کے لئے قرآن وحدیث اور سیرت پاک میں اتنی قیمتی رہنمائی موجود ہے کہ باہر جانے کی ضرورت ہی لاحق نہیں، تاہم داعی کی نظر میں قرآن پاک، احادیث اور سیرت کی وہی تعبیر وتشریح معتبر ہوتی ہے، جس پر اسلاف گامزن رہے ہیں اور جو سلف سے ثابت شدہ ہے، اس لئے کہ اہم معاملات میں سلف سے ہٹ کر دین کی تعبیر وتشریح اور دعوت الی اللہ کا کام افراد کے لئے دین کے نام پر نئی دعوتوں اور نئی تحریکوں کے فروغ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح یہ نئی دعوتیں امت کو جوڑنے کی بجائے ان کو توڑنے اور دعوت واصلاح کے نام پر گمراہی کا موجب بن سکتی ہیں، اس لئے قرآن میں سبیل المومنین کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے:

سبیل المومنین کیا ہے؟ سبیل المومنین یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور رسالت پر ایمان کی دعوت دی جائے، لوگوں کی تربیت وتزکیہ کا اہتمام کیا جائے، انہیں اعمال صالحہ کی طرف لایا جائے۔ انہیں اخلاق حسنہ کا حامل بنایا جائے، انہیں اللہ کی محبت ومعرفت کی راہ پر لایا جائے، ان کے دل کے مفتی کو طاقتور سے طاقتور تر بنایا جائے، تاکہ زندگی کے ہرمعاملہ میں یہ مفتی بُرائی سے بچائے اور ہر نیکی پر عمل کرنے پر ابھار سکے اور اس کی استعداد پیدا کر سکے، افراد معاشرہ کی سیرت وکردار کی تعمیر کا کام کرکے، معاشرہ کو اتنا مستحکم کیا جائے کہ باطل اور شر کی قوتوں کو روکنے والی قوتیں طاقتور سے طاقتور تر ہوجائیں۔

سبیل المومنین سے ہٹ کر دین کی ایسی تعبیر، جس میں ریاستی حکمرانوں سے ٹکراؤ دین کا مقصود ہوجائے، اپنی قوتیں کلمہ گو افراد سے مقابلہ اور قتال میں صرف ہوجائیں، یا سیاست برائے سیاست دین کا نصب العین قرار ہوجائے، یا عالمی کفر کی سازشوں کے خلاف ردعمل کا شکار ہوکر، قوت نہ ہونے کے باوجود اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں۔

اجتہاد کے نام پر فرد کی آزادی، عورت ومرد کی مساوات اور عورت کا مرد کے دائرہ کار میں شامل ہوکر گھر کی ذمہ داریوں سے فرار، اپنی ناقص اور غیر تربیت یافتہ عقل کے ذریعہ دین کے اہم اور متفقہ الیہ مسائل میں نئی تحقیق پیش کرکے، امت میں نئے گروہ کو مستحکم کرنا، یہ چیز بھی سبیل المومنین کے سخت منافی ہے۔

اس کے معاشرہ پر جو نتائج نکل سکتے ہیں، وہ انتشار وخلفشار کی صورت میں ہی نکل سکتے ہیں۔

قرآن نے سبیل المومنین کی راہ اختیار کرنے کو لازم قرار دیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا جہنم کی صورت قرار دی ہے **وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ**. (سورۃ النساء آیت ۱۱۵) (جو کوئی بعد اس کے کہ اس پر راہ ہدایت کھل چکی، رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستہ کے علاوہ (کسی راستہ کی) پیروی کرے گا، ہم اسے ایسا کرنے دیں گے اور پھر ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے)۔

اس آیت کی تشریح میں ایک فاضل مفسر لکھتے ہیں:

آیت کے اس جزو سے فقہاء کو ایک بہت بڑی اصل ہاتھ آ گئی ہے کہ اس کو انہوں نے اجماع امت کے شرعی حجت ہونے کا موجب قرار دیا ہے اور تقریر استدلال یہ ہے کہ طریق مومنین سے الگ ہونا، جب حرام اور مستحق جہنم ٹھہرا تو لازمی ہے کہ اس کا عکس یعنی اتباع طریق مومنین واجب ہو، اور اس کی مخالفت بھی کتاب وسنت کی مخالفت کے بعد ناجائز ٹھہرے اور یہاں قرآن مجید نے عدم اتباع طریق مومنین کو مخالفت کے ساتھ جمع کرکے فرمایا ہے۔ (تفسیر ماجدی صفحہ ۷۹۶ جلد اول مولانا عبدالماجد دریابادی)

داعی کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سبیل المومنین کی راہ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے، وہ اس راہ سے انحراف کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

اس کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ سبیل المومنین کے بغیر اسے نور نبوت کے اجزاء جو صحابہ کرام، تابعین کرام اور بزرگان دین سے ہوتے ہوئے اب تک منتقل ہوتے رہے ہیں، اسے نور نبوت کے ان اجزاء سے محرومی کی صورت میں سزا ملنے لگتی ہے۔ اس سے باطنی بصیرت سلب کر لی جاتی ہے اور اسے نفس کے یرغمال یافتہ عقل کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

داعی ومزکی کا بنیادی کام لوگوں کا تزکیہ کرنا ہوتا ہے

داعی جو مزکی ومربی بھی ہوتا ہے، اس کا سب سے بڑا کام لوگوں کا تزکیہ کرنا ہوتا ہے اور تزکیہ کی دعوت دینی ہوتی ہے، قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہے. **اِذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَى أَن تَزَكَّى**. (تم فرعون کی طرف جاؤ اور اسے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تیرا تزکیہ ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام بنی اسرائیل کو فرعون سے آزادی دلانا ہی نہیں تھا، بلکہ فرعون کی اصلاح کا کام بھی ان کے مقاصد میں شامل تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعثت کے مقاصد میں بھی قرآن نے تزکیہ کو فیصلہ کن اہمیت سے پیش فرمایا گیا ہے۔

تزکیہ کی اہمیت اور اس کے فوائد وثمرات

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ. جیسا کہ ذکر ہوا کہ داعی کا سب سے اہم اور بنیادی کام افراد کے نفس کی اصلاح اور ان کا تزکیہ کرنا ہے۔ تزکیہ سے اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں، انسانی جوہروں سے بہرہ وری ہوتی ہے، فرد، اللہ کے بندوں سے سچی خیرخواہی، بہی خواہی اور ان کی دنیا وآخرت کی بہتری کا حریص ہوجاتا ہے، تزکیہ، فرد وافراد کو پاکیزہ روحانی واخلاقی اوصاف کا حامل بنا دیتا ہے، تزکیہ سے فرد مادی آلائشوں کی سطح سے بلند ہوکر، محض اللہ کے لئے جینے کے سلیقہ سے فیضیاب ہوتا ہے، تزکیہ، فرد میں اتنی اخلاقی بلندی پیدا کر دیتا ہے کہ فرد اپنے بھائیوں وساتھیوں کے لئے ہر طرح کے ایثار وقربانی کے لئے تیار ہوجاتا ہے، تزکیہ، فرد وافراد کو حب جاہ وحب مال، حرص وہوس اور مادی دنیا پر گرتے رہنے کی نفسیات سے بلند کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ تزکیہ، فرد کے نفس میں اتنی پاکیزگی اور صلاحیت پیدا کر دیتا ہے، جس سے اس کے لئے زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ ورسول کی اخلاص

کے ساتھ اطاعت کرنا آسان ہوجاتا ہے، تزکیہ، خواہشات نفس کو پامال کرکے فرد کو دوسری دنیا یعنی آخرت کی دنیا کا انسان بنا دیتا ہے، تزکیہ، فرد میں دوسرے افراد کے ساتھ معاملات کو سلیقہ وخوش اسلوبی سے سرانجام دینے اور لوگوں کے قصوروں کو یک طرفہ طور پر معاف کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور کرتا ہے، تزکیہ، فرد کے لئے آخرت کی زندگی کو منتہائے مقصود بنانے کا ذریعہ بنتا ہے، تزکیہ، فرد کو مادی دنیا کی نت نئی آسائشوں، سہولتوں اور لذتوں سے متمتع ہونے کے سلسلہ میں اس کے دل کو سرد کردیتا ہے۔ تزکیہ، فرد کو سرمایہ داروں اور مالداروں سے مشابہت پیدا کرنے اور ان کی سی طرز زندگی اور طرز معاشرت اختیار کرنے کے سلسلہ میں ان کے دل میں کراہت وبیزاری پیدا کردیتا ہے۔

تزکیہ کے یہی ثمرات، فوائد وبرکتیں ہیں، جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد تزکیہ بیان فرمایا گیا ہے۔ اس موضوع پر اس دور کے ایک عالم ربانی حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے بہت قیمتی علمی بحث کی ہے۔ اس بحث کی اہمیت کے پیش نظر ہم ان کی یہ تفصیلی بحث یہاں نقل کررہے ہیں۔

''آیات کی تلاوت، کتاب کی تعلیم اور حکمت کی تعلیم کا مقصد بھی تزکیہ کرنا ہے ایک عالم ربانی کی قیمتی بحث۔''

قرآن حکیم نے چار مقامات پر حضرت خاتم الانبیاء، جناب رسول اللہ ﷺ کے چار منصب بیان فرمائے ہیں:

(۱) آیات پڑھ کر سنانا۔

(۲) تزکیہ کرنا، یعنی کفر وشرک، بدعملی وبداخلاقی اور امورِ جاہلیت سے ان کو پاک وصاف کرنا۔

(۳) کتاب اللہ کے احکام کی تعلیم دینا اور اس کے مضامین کی تشریح کرنا۔

(۴) حکمت ودانائی، احکام کے علل وغایات اور شریعت کے اصول ومقاصد کی تعلیم دینا۔

تزکیہ سے مراد عقائد ونظریات اور اعمال واخلاق کی پاکیزگی ہے، قرآن کریم نے تین مقامات پر تزکیہ کو ''تعلیم'' سے مقدم ذکر فرمایا، جس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ بقدر ضرورت تزکیہ تعلیم سے پہلے ہونا چاہیے، تعلیم اسی وقت مفید اور بارآور ہوسکتی ہے جب کہ قلوب میں اس کے قبول کرنے کی اہلیت اور جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو، زمین کو پہلے کاشت کے قابل بنایا جائے، پھر تخم ریزی کی جائے، ورنہ وہی کیفیت ہوگی جو عارف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم خس

یہ تزکیہ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے فیضانِ صحبت اور مکارمِ اخلاق سے حاصل ہوتا تھا اور اب بھی بقدرِ استعداد اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے ربط وتعلق اور ان کی صحبت اور مجالست سے حاصل ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تعلیم کتاب وحکمت سے بھی اصل مقصود تزکیہ ہے، یہ نہ ہوتو ساری تعلیم بیکار ہے، اعمال واخلاق کے بغیر نرے علوم ومعارف کی حق تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر نہیں، آدمی ساری دنیا کی کتابیں چاٹ لے، لیکن اگر انسانی اخلاق اور ایمانی اعمال نہیں تو پڑھا لکھا جانور تو ہوسکتا ہے، مگر انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

تزکیہ کے بغیر نہ ایمان کے رسوخ کی کیفیت اور یقین واطمینان کی قوت پیدا ہوگی، نہ اخلاق درست ہوسکیں گے، نہ اخلاص کی دولت ملے گی، نہ اعمال پر مداومت نصیب ہوگی، نہ اندر کا فرعون (مکار نفس) ہلاک ہوگا، نہ مخلوق سے لڑائی بند ہوگی۔

نفسِ ما ہم کم تر از فرعون نیست

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: **''تعلمنا الایمان، ثم تعلمنا القرآن''** (سنن ابن ماجہ، المقدمتہ، باب فی الایمان، ص: ۷، ط: قدیمی) کہ: ''ہم نے پہلے ایمان سیکھا، پھر قرآن سیکھا۔''

یہ ایمان کا سیکھنا ہی تزکیہ کہلاتا ہے کہ قلب غیر اللہ کے بتوں سے پاک ہو، اعمال ریا وغیرہ سے پاک ہوں اور نفس کمینے اخلاق سے پاک ہو، معاشرہ امور جاہلیت سے پاک ہو، کمائی حرام اور مکروہ ذرائع سے پاک ہو، وغیرہ ذلک۔

یہی تزکیہ تھا، جس کی وجہ سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی بشارتوں سے نوازا اور انہیں آسمانی وحی کی شہادت اور سند ملی۔ سورۂ فتح میں ان کے امتیازی اوصاف ذکر کرتے ہوئے ایک وصف باہمی رحمت وشفقت ذکر کیا گیا ہے: **''رحماء بینھم''** یہ وصف کامل تزکیہ کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے اور اسی کو نہ سمجھنے کی خرابی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پہلا وصف یہی بیان فرمایا: **''ابرھم قلبا''** کہ ان کے دل پاک صاف تھے، دوسرا وصف

بیان فرمایا: **"واعمقهم علما"** ان کا علم بڑا گہرا تھا، تیسرا وصف بیان فرمایا: **"واقلهم تکلفا"** ان کی زندگی تکلفات اور تصنع سے پاک تھی۔ (مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، الفصل الثالث، ج:۱، ص:۳۲، ط: قدیمی)

حضرات صوفیائے کرام رحمتہ اللہ علیہم، جن کے ذریعہ دین کی تبلیغ واشاعت سلاطین کی تلوار اور علماء کے قلم سے بھی زیادہ ہوئی ہے، ان کا خاص موضوع یہی ہے کہ نفوس کی تربیت اور اخلاق کا تزکیہ کیا جائے، ان کے یہاں بھی تربیت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے جذب ہو، پھر سلوک، اسی کا نام مجذوب سالک رکھتے ہیں۔ بظاہر یہ طریقہ اقرب الی القرآن ہوگا، البتہ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ جہاں آنحضرت ﷺ کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی ہے، آنحضرت ﷺ کے ان چار مناصب میں سے تزکیہ کو کتاب وحکمت کی تعلیم کے بعد سب سے آخر میں رکھا ہے، اس سے ایک تو اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا اول وآخر مقصد تزکیہ ہے، دوسرے اس طرف اشارہ ہے کہ تزکیہ بقدر ضرورت تو تعلیم سے پہلے ہونا چاہیے، مگر کامل تزکیہ کی نوبت علم کے بعد ہی آسکتی ہے، یعنی علم کے بعد ہوگا اور علم ہی ذریعہ بنے گا عمل کا، گویا اس آیت میں تربیت کا دوسرا طریقہ بیان فرمایا ہے، جو حضرات صوفیاء کے یہاں سالک مجذوب کہلاتا ہے، لوگوں کی استعدادیں مختلف ہوتی ہیں، کسی کو تعلیم کے بعد بھی تزکیہ کی ضرورت رہتی ہے اور کسی کو تزکیہ کے بعد تعلیم کی حاجت ہے۔ نہ تزکیہ کے مراتب ختم ہوتے ہیں، نہ تعلیم کی انتہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت رسول اللہ ﷺ کا منصب صرف تعلیم اور سمجھانا ہی نہیں تھا، بلکہ اس کی تعمیل کرانا اور قوم کو ایک باعمل امت بنانا بھی تھا، جب تک آنحضرت ﷺ کے دیے ہوئے نقشہ کے مطابق تعلیم وتربیت پر محنت نہیں ہوتی اور افراد کی اصلاح کے ذریعہ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں نہیں آتا، سیاسی محنت صحیح طریق پر بار آور نہیں ہوگی اور تمام قوتیں شروفساد کی نذر ہوجائیں گی۔" (ماخوذ: ماہنامہ الفاروق کراچی، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۸ ہجری)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ داعی اور تزکیہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم ہیں۔ تزکیہ کے بغیر داعی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن پاک، سیرت نبوی اور اسلاف کی زندگیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ ایسی چیز ہے، جو اپنے طور پر نہیں ہوتا اور نہ ہی کتابوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ بلکہ تزکیہ کا فریضہ شخصیت سرانجام دیتی ہے، اس شخصیت کو اہل اللہ کہیں، صاحب معرفت شخصیت کہیں یا صاحب دل شخصیت، اور اس شخصیت کا تعلق نور نبوت کے ان اجزاء سے ہوتا ہے، جو صحابہ کرام کی صحبت اور سلف سے خلف تک صحبت کے تسلسل سے منتقل ہوتے ہیں۔ امت کا تسلسل یہی ہے، اس تسلسل کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں اسلام کے نام پر قیل قال، لچھے دار گفتگو، سیرت وکردار میں بحران ومفاسد اور تضادات ہی جنم لیتے ہیں۔

داعی وصوفی کی خصوصیات

ایک نظر میں

داعی وصوفی جن خصوصیات وصفات کا حامل ہوتا ہے، یہاں مختصرًا وہ خصوصیات پیش کی جاتی ہیں۔

• وہ لوگوں کی دنیا وآخرت کی بھلائی کا فکرمند ہوتا ہے اور اس کے لئے ہرممکن حد تک کوشاں بھی۔

• وہ اس فکر کا حامل ہوتا ہے کہ دنیا وآخرت کی ساری کامیابیاں اللہ سے والہانہ محبت کی راہ اختیار کرنے سے وابستہ ہیں۔

• وہ تزکیہ کو بنیادی اور فیصلہ کن اہمیت دیتا ہے، وہ تزکیہ کی دعوت دیتا ہے، تزکیہ کی طرف بلاتا ہے اور افراد کے تزکیہ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور یہ فریضہ اس طرح سرانجام دیتا ہے کہ اپنے تزکیہ سے کسی بھی مرحلہ پر غافل نہیں ہوتا۔

• وہ دنیاوی زندگی کو متاعِ قلیل سمجھتا ہے، اس کی فکر کا مرکز آخرت کی تیاری ہوتی ہے۔

• اس کی اپنی انفرادی جداگانہ شخصیت نہیں ہوتی، وہ سراپا دعوت ہوتا ہے، وہ اپنی شخصیت کو دعوتی کام اور لوگوں کی تربیت وتزکیہ کے امور میں گم کردیتا ہے اور اس پر یہی فکر سوار ہوتی ہے، وہ دوسرے سارے افکار سے خالی ہوتا ہے۔

• داعی اپنے ذاتی مسائل اللہ کے سپرد کر دیتا ہے، دعوتی کاموں میں فنائیت کی وجہ سے اللہ اس کی ساری ضروریات کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے، اس لئے وہ دنیا کے مسائل کے سلسلہ میں لوگوں سے توقعات وابستہ کرنے اور ان کی طرف نظریں جمانے سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

• وہ فقر کو پسند کرتا ہے اور فقر کی زندگی کو اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے۔

• وہ مالداروں کی صحبت کو اپنے لئے سم قاتل سمجھتا ہے، البتہ جو مالدار راہ محبت کے ذریعہ تزکیہ کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان سے وہ محبت کرتا ہے، اس کی نظر میں ایسے افراد، مالدار نہیں، بلکہ فقیر ہیں، اس لئے کہ وہ دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔

• وہ خود احتسابی کے عمل کو فیصلہ کن اہمیت دیتا ہے اور زندگی کے کسی بھی مرحلہ وموڑ پر اپنے احتساب سے غافل نہیں ہوتا۔

• وہ معاشرہ میں موجود دوسرے داعیوں وصوفیوں (اہل اللہ) کے آداب بجالانے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

• وہ حالات پر نبض رکھتا ہے، لوگوں کی نفسیات کو سمجھتا ہے، اس لئے وہ دعوتی اور تربیتی کاموں میں حکمت اور حکیمانہ طریقہ سے کام لیتا ہے۔

• اس کا کوئی مخالف اور دشمن نہیں ہوتا، اللہ سے دور افراد کو وہ قابل رحم سمجھتا ہے اور ان کی اصلاح کے لئے دعاگو اور فکرمند رہتا ہے۔

• وہ قیل قال سے زیادہ عمل کا غازی ہوتا ہے، وہ اپنے پاکیزہ کردار سے لوگوں کے سامنے اسلامی نقوش متعین کرتا رہتا ہے۔

• وہ کینہ، حسد اور بدگمانی وغیرہ سے ہرممکن حد تک محفوظ رہنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

• معاشرہ وافراد معاشرہ کے بگاڑ پر اس کی تنقید میں بھی دردمندی اور محبت کا پہلو غالب ہوتا ہے، اس کی تنقید سے مخالفوں میں ضد پیدا ہوجانے کے بجائے غوروفکر کرنے کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔

• وہ وحدت امت کے تصور کو فروغ دینے کا ذریعہ بنتا ہے اور امت کو گروہوں میں تقسیم کرنے اور امت پن سے ہٹ کر اپنا گروہ مستحکم کرنے کا متحمل نہیں ہوتا۔

• وہ قرآن وسنت اور سیرت پاک کو فیصلہ اہمیت دیتا ہے، اس کی بنیادی رہنمائی کی ماخذ یہی مقدس چیزیں ہوتی ہیں۔

• وہ معاشرہ میں دنیاداری کی بڑھتی ہوئی رَو سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ دنیا سے بے نیازی کی روش پر مستقل مزاجی سے گامزن ہوتا ہے۔

• وہ آسائش اور آرام دہ زندگی کے لئے تاویلات کا سہارا ہرگز نہیں لیتا۔

• چونکہ دوسروں کی تربیت کا کام اس کے سپرد ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنے قول وعمل سے غلط اور غیر معیاری نمونے اور غیر معیاری مثالیں پیش نہیں کرتا۔

• چونکہ دعوتی وتربیتی کام اس کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے،اس کے باوجود وہ شہرت اور اس کے ذرائع سے دور رہتا ہے اور گمنامی کو ترجیح دیتا ہے۔

• وہ اپنے معیار زندگی کو متوسط افراد کے معیار زندگی سے بلند رکھنے کا ہرگز روادار نہیں ہوتا۔

• وہ اشتعال، جھنجھلاہٹ اور غصہ کے مواقع پر بھی حالت اعتدال اور حالت ٹھہراؤ میں ہوتا ہے۔

• وہ اپنے آپ کو مٹا چکا ہوتا ہے، اس لئے وہ معاشرہ میں اپنے لئے نمایاں حیثیت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

• اللہ کی شان عظمت کا غلبہ اس کو آخرت میں اللہ سے ملاقات کے حوالے سے بہت زیادہ متفکر کردیتا ہے۔

• وہ ان خام داعیوں اور خام صوفیوں کو (جو شہرت اور دنیا بنانے کے لئے فکرمند ہوتے ہیں) انہیں قابل رحم سمجھتا ہے اور ان کے لئے دعا گو ہوتا ہے۔

• وہ تنقید برائے تنقید یا تنقید برائے حصول لذت سے بڑی حد تک محفوظ ہوتا ہے، اس کی تنقید میں اصلاح کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

• وہ افراد کو ہر وقت دستیاب ہوتا ہے اور اس حوالے سے وہ عذر وبہانے تراشنے سے بچنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

حقیقی صوفی اور اس کی خصوصیات

اکابر اہل اللہ کی نظر میں

تصوف دودھاری تلوار ہے۔ اگر زندگی کے ہر موڑ پر اپنی اصلاح کی فکر غالب رہی، بزرگ بن کر مال کمانے اور بڑا بننے کی فکر سے حفاظت کی استعداد حاصل رہی تو یہ تلوار نفس اور نفسانی قوتوں کو قطع کرنے اور فرد کے لئے سعادت دارین کا ذریعہ بنے گی، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا، غیر معمولی مجاہدوں سے پہلے فرد اس منصب پر فائز ہوا یا فائز کردیا گیا اور اصولوں کی احتیاط کے معاملہ میں لاپرواہی کا مظاہرہ ہوا، مرید بنانے اور مال کمانے کی دھن سوار ہوئی اور فقر کی بجائے مالدارانہ روش اختیار کی گئی تو یہ تلوار فرد کی روح کو قطع کرنے کا ذریعہ بنے گی، دنیا میں تو فرد کو شاید بڑے اور مالدار پیر بننے کا شرف حاصل ہو، لیکن آخرت میں وہ پکڑا جائے گا، اس لئے کہ تصوف واحسان جیسے پاکیزہ ادارہ کو ملعون دنیا بنانے اور اپنی شہرت کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا، محبوب کے عتاب ہی کا موجب ہوسکتا ہے۔

تصوف کو ایک طرح سے پلصراط سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ یہاں فرد، نفس کی پلطراط سے گزر رہا ہوتا ہے کہ اب گرا کہ تب گرا۔

اس لئے کہ اصلاح نفس، تہذیب نفس اور تزکیہ کے مراحل طے کرتے ہوئے فرد کا نفس، مکر وفریب کی نئی نئی واردات اور اپنی الوہیت کے نئے نئے احساسات کے ساتھ سامنے آتا رہتا ہے۔

نفس کے مکر وفریب کی ان ادلتے بدلتے حالات میں طالب کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ تیز اس پلصراط سے کہیں گر کر جہنم کا ایندھن نہ بنے۔ ان حالات میں طالب ہل کررہ جاتا ہے اور قیامت خیز منظر سے دوچار ہوتا رہتا ہے، جو طالب استقامت کا ثبوت دیتے ہیں، حقیقی اہل اللہ کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر، محبوب کی راہ پر استقامت سے چلتے رہتے ہیں، اللہ محبوب ان کی دستگیری فرما کر، بالآخر انہیں نفس پرستی کی قوتوں پر مبنی پلطراط سے بحفاظت گزار دیتا ہے، لیکن جو افراد اس پلطراط کو دشوار گزار سمجھکر، راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں یا نفس کی اکساہٹ پر

وقت سے پہلے بزرگی کے مقام پر فائز ہوجاتے ہیں، انہیں ان کے نفس کے حوالے کرکے، نفس کی برپا کردہ مادیت پرستی کی آگ کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ اور وہ بزرگی کی آڑ میں مالدار سے مالدارتر بن جاتا ہے، توجہ اور وظائف کے استعمال سے لوگوں کو مسخر کرنے اور اپنے مریدوں کی تعداد میں اضافہ پر اضافہ کرنے کی دھن میں لگ جاتا ہے۔

تصوف دراصل نام ہے قرآن وسنت سے ماخوذ بزرگان دین کے متعین کردہ اصولوں کا، ان اصولوں میں ذکر وفکر کے مجاہدے بھی شامل ہیں تو صبر وشکر، توکل، قناعت اور فقر کے اجزا بھی موجود ہیں۔

ان اصولوں میں مالداروں وسرمایہ داروں سے بے نیازی اور ان سے استغنا کا اصول بھی شامل ہے تو نفس کا آخری وقت تک کڑا احتساب کرتے رہنے کا اصول بھی موجود ہے۔

تصوف سے ان اصولوں کو نکالنے کے بعد تصوف بے روح ہوجاتا ہے۔

تصوف، مروجہ توجہ اور تسخیری وظائف کا نام نہیں ہے، بلکہ تصوف تو حقیقی اہل اللہ کی صحبت کے زیر اثر اللہ کے کثرت ذکر کے نور سے نفسی قوتوں کو شکست دینے، دنیا کے حوالے سے سارے مقاصد سے دستبردار ہونے اور تصفیہ وتزکیہ سے دل کو منور کرنے اور اسلامی شریعت کو مقصود بنانے کا نام ہے۔

اکابر بزرگوں نے مزکی وصوفی کے جو اہداف اور خصوصیات بیان کئے ہیں اور اہل تصوف کے جو خطوط ونقوش متعین کئے ہیں، وہ ایسے ہیں، جو اس دور میں نہ صرف فراموش ہوئے ہیں، بلکہ عام طور پر ان اہداف وخصوصیات کا ادراک ہی باقی نہ رہا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ تصوف وبزرگی کے نام پر جو فرد بھی کچھ وظائف وعملیات کی مشقوں اور کچھ ذکر وفکر کی صلاحیتوں اور توجہ کے ایک مرکزی نکتہ پر ارتکاز یعنی ہپناٹزم کی مشقوں سے سامنے آتا ہے، اس کے پیچھے لوگوں کا ہجوم جمع ہوجاتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اکابر اہل اللہ اور سلف صالحین کے تصوف کے پیش کردہ بنیادی اصولوں، اہداف اور اہل تصوف کی خصوصیات سے آشنائی نہیں ہے اور چونکہ توجہ کی حامل شخصیتیں ان کو متاثر کرکے ان میں کیفیات پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں، اس لئے ایسے عاملوں اور ناقص پیروں کے سامنے خودسپردگی اختیار کرلی جاتی ہے، جو دین ودنیا کے نقصان کا موجب ہے۔

اکابر بزرگوں نے صحیح صوفی اور مزکی کے جو خدوخال اور خصوصیات بیان کی ہیں، ذیل میں کچھ اکابر بزرگوں کی ملفوظات پیش کی جارہی ہیں، تاکہ صحیح وغلط اہل تصوف کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کسوٹی سامنے آسکے۔ (امت کی اہم شخصیتوں کی طرف سے یہ نصیحتیں ایسی ہیں، جسے دل میں جگہ دینے اور ہر وقت پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ بگاڑ کے علاوہ کچھ اور نکل سکے، مشکل ہے۔ مرتب)

حضرت حسن بصریؒ

- حضرت حسن بصریؒ نے سعید بن جبیر کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، تین کام کبھی نہ کرنا (۱) بادشاہوں کی بساط پر کبھی قدم نہ رکھنا، اگرچہ وہ شفقت کریں۔ (۲) کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا، خواہ وہ رابعہ وقت ہو اور تو اسے کتاب اللہ کی تعلیم دیتا ہو۔ (۳) مزا میر نہ سننا، اگرچہ تو بزرگی کا درجہ رکھتا ہو، اس لئے کہ یہ آفت سے خالی نہیں، بالآخر اپنے زخم لگادیتی ہے۔

- فقیہ وہ ہے، جو دنیا سے پرہیز کرے، اپنے گناہوں کو دیکھے، اپنے رب کی عبادت کا پورا پابند ہو، جس نے دولتمند کی عزت کی، اللہ نے اسے ذلت دی۔ (حقیقی فقیہ تو حکمت وبصیرت کا حامل ہوتا ہے، اپنے نگاہوں کے مشاہدہ کے سلسلہ میں اس کی نظر گہری ہوتی ہے۔ ذکر وعبادت اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے وہ نفس کی خاطر دولتمندوں کی عزت کا متحمل نہیں ہوتا۔ مرتب)

- دنیا تمہاری سواری ہے، اگر تم اس پر سوار ہوگئے تو یہ تمہیں لئے چلے گی، اگر وہ تم پر سوار ہوگئی تو وہ تمہیں ہلاک کرکے چھوڑے گی۔

- عقلمند وہ ہے، جو دنیا کو خراب کرکے آخرت کو بنائے، جو بات کسی کو کہنی ہو، لازم ہے کہ فرد پہلے خود اس پر عمل کرے، میرے نزدیک دین کے بھائی، بیوی بچوں سے زیادہ عزیز ہیں، اس لئے کہ وہ دین کے ساتھی ہیں اور بیوی بچے دنیا کے ساتھی اور دین کے دشمن ہیں۔

- ایک دن آپ گھر میں رو رہے تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ پرہیزگار زندگی بسر کررہے ہیں، پھر کیوں روتے ہیں۔ فرمایا، ممکن ہے بے قصد وبے علم مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہوجائے اور میں نے ایسی جگہ قدم رکھا ہو، جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہو۔

- کسی شخص نے آپ سے آپ کا حال پوچھا، فرمایا، ان لوگوں کا کیا حال ہوگا، جو دریا میں ہوں اور کشتی الٹ جائے اور ہر شخص کو تخت کا ایک ٹکرہ مل جائے، اس شخص نے کہا کہ ان لوگوں کا بہت برا حال ہوگا، آپ نے فرمایا، میرا بھی یہی حال ہے۔

- فرد، دنیا میں جتنی ملول اور غمگین زندگی بسر کرے گا، اسی مناسبت سے اس کے عمل صالح

کی آبیاری ہوگی۔ (یہاں طالب حق کی اس غمزدگی کا ذکر کیا گیا ہے، جو راہ عشق میں داخل ہونے کے بعد مجاہدہ نفس اور محبوب کے جلالی صفات کے عکس کے نتیجہ میں اسے لاحق ہوتی ہے، طالب عرصہ تک غم زدگی کی اس حالت میں مبتلا ہوتا ہے۔ مرتب)

- جو شخص ہر وہ بات، جو منہ آئے کہہ دیتا ہے، وہ اپنے آپ کو ہلاک کردیتا ہے۔ (زبان ہر وقت چٹخارہ چاہتی ہے اور نفس کی آلہ کار ہوتی ہے، اس لئے اس کی مسلسل حفاظت اور نگرانی کرتے رہنا ضروری ہے، ورنہ یہ فرد کے لئے ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مرتب)

- صبر، دنیا کی ساری نیکیوں کی جڑ ہے۔ (بندہ مومن کو زندگی کے ہر موڑ پر صبر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، مزاج کے خلاف باتیں برداشت کرنا، لوگوں کی الٹی سیدھی باتیں برداشت کرنا، نفس کی مزاحمت کرنا، غرض کہ بندہ مؤمن کی ساری زندگی صبر ہی سے عبارت ہے اور صبر ہی سے درجات کی بلندی ہوتی ہے اور روحانی ارتقا نصیب ہوتا ہے۔ مرتب)

دنیا کا عذاب یہ ہے کہ فرد کا دل مردہ ہوجائے (یعنی اس میں اللہ کی معرفت کی بات سننے کی طلب موجود نہ رہے۔ مرتب)۔

جو آج بے خوف ہے، کل اسے ڈرایا جائے گا، جو آج ڈرتا ہے، وہ کل بے خوف ہوگا۔

- نفس سے بڑھکر دنیا میں منہ زور اور بدلگام جانور کوئی نہیں ہے۔ (نفس کی صورت یہ ہے کہ وہ سارے درندوں سے بھی زیادہ سخت درندہ ہے۔ موجودہ دور میں نفس کی اس درندگی کا عالمی سطح سے لے کر مقامی سطح تک اکثر مشاہدہ ہورہا ہے۔ آج سرمایہ داروں کا نفس ساری انسانیت کو پامال کررہا ہے، اپنے زریل مقاصد کے لئے قتل وغارت گری کی فضا گرم کررہا ہے۔ مقامی سرمایہ دار جو حکمران کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے، دنیا کے بنکوں میں اس کے اربہا ڈالر موجود ہیں، لیکن وہ اتنا سنگ دل ہے کہ لوگوں کو بھوک سے مرتے ہوئے دیکھنے کے باوجود ان کی امداد کے لئے تیار نہیں۔ نفس کی یہی درندگی ہے، جو تہذیب نفس کی کاوشوں کے بغیر دور نہیں ہوسکتی۔ مرتب)

- دولت وہی شخص طلب کرتا ہے، جسے اللہ ذلیل کرے۔ (ضرورت سے زیادہ دولت کی طلب سے عمومی طور پر فرد کی نفسیات میں فساد برپا ہونے لگتا ہے، غریب انسانوں کو حقیر سمجھنے کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہے۔

حب جاہ وحب مال کے امراض کے ساتھ ساتھ قلبی سکون کی نعمت عظمیٰ سلب ہوجاتی ہے۔ قومی وملی تعمیر کے کاموں میں دولت خرچ کرنے کی استعداد ختم ہوجاتی ہے دولت کے اتنے زیادہ نقصانات کے باوجود حالت یہ ہے کہ ہر لگ بھگ ہر فرد دولت کے حصول کے اسی جنون میں مبتلا ہے۔ یہ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مرتب)

- جو دوسروں کی باتیں تم سے بیان کرتا ہے، وہ تمہاری باتیں دوسروں سے ضرور کہے گا۔

- مومن کی شان یہ ہے کہ اس کی صبح ہوتی ہے، وہ ملول اور غمگین ہوتا ہے اور اس کی شام ہوتی ہے تو وہ ملول وغمگین ہوتا ہے۔ (اس لئے کہ اس پر اللہ کے سامنے پیش ہوکر وقت، صلاحیتوں اور توانائیوں کے استعمال کے بارے میں حساب کتاب پیش کرنے کا احساس غالب ہوتا ہے۔ مرتب)۔

حضرت بایزید بسطامی

میں بارہ سال تک جنگلوں میں نفس کے حق میں لوہا بنا رہا۔ اور نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدہ کی آگ سے گرم کرکے، ملامت کے ہتھوڑے سے کوٹتا رہا۔ آخر کار میں نے اسے آئینہ بنالیا، پانچ سال آئینہ میں بنانے میں صرف ہوگئے۔ اور طرح طرح کی عبادات وریاضیات سے اس آئینہ کو صیقل کیا، پھر ایک سال اسے اغیار کی نظر سے دیکھا، پھر بھی اس کو غرور اطاعت کے بھروسے اور عمل کی خودپسندی میں مبتلا دیکھا، پانچ سال اور کوشش کی، پھر جب اسے دیکھا تو وہ مردہ تھا۔ (ہر حقیقی صوفی کو نفس کو پامال کرنے کے لئے اس طرح کے مجاہدے کرنے پڑتے ہیں۔ جب حضرت بایزید جیسی شخصیت کو نفسی قوتوں کو شکست دینے کے لئے اتنے غیرمعمولی مجاہدوں سے لینا پڑا تو ہمارے لئے مجاہدوں سے صرف نظر کرنا کیسے ممکن ہے۔ موجودہ دور میں تصوف کے نام پر ہونے والی ساری خرابیاں دراصل ذکر وفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں سے گزرے بغیر بزرگی کے مقام پر فائز ہونے ہی کا نتیجہ ہے۔ مرتب)

- میں نے سارے ہاتھوں (یعنی ساری کاوشوں) سے اللہ تک پہنچنے کی کوشش کی، لیکن جب تک مصیبتوں کے ذریعہ اسے تلاش نہ کیا، وہ نہ ملا، میں سارے قدموں سے اس کی راہ میں گیا، لیکن جب تک دل کے قدموں سے نہ گیا، منزل پر نہ پہنچ سکا۔ (صوفی، اللہ کے جلالی صفات کے عکسوں سے گزر کر، روزانہ مرتا ہے اور روزانہ زندہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے صوفی کو مالی اور جسمانی طور پر مختلف تکالیف وبیماریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ان ساری آزمائشوں سے گذر

کر، صبر وشکر کا مزاج راسخ ہونے کے بعد کہیں جا کر اسے حالت بقا میں لایا جاتا ہے۔ مرتب)

- سچا عابد اور سچا عامل وہ ہے، جو مجاہدوں کی تلوار سے اپنی ساری مرادوں کو قتل کرے اور ساری خواہشات وتمناؤں کو اللہ کی محبت میں فنا کردے۔ (مجاہدوں کے ذریعہ خواہشات کی مکمل طور پر پامالی اور محبوب کی رضا پر راضی رہنے کی نفسیات کی پختگی کے بغیر کام نہیں بنتا اور طالب کو طویل عرصہ تک نفس سے معرکہ آرائی کے لئے تیار ہونا پڑتا ہے۔ مرتب)

- عارف کی خاموشی سے مطلب ہوتا ہے کہ (وہ دل کی گہرائیوں سے) محبوب سے گفتگو کرے، آنکھوں کو بند کرنے سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ محبوب کا مشاہدہ کرے۔ (عارف کا سب سے اہم کام اپنے اندر میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی ہوتا ہے وہ آخر وقت تک اندر میں ڈوبنے کے عمل سے فارغ نہیں ہوتا، اس لئے کہ دل وروح کی محبوب کے لیئے مشاہدہ کی طلب ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی)۔

- کوئی گناہ تمہیں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا، جس قدر ایک مسلم بھائی کو بے عزت کرنا۔ (مسلمان کی دل آزاری کرنا، درویش کی نظر میں یہ گناہ کبیرہ میں شامل ہے، اس لئے درویش اس معاملہ میں بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس سے جب کبھی اس طرح کا گناہ سرزد ہوجاتا ہے، اس کے دل کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے جب تک وہ اس کے ازالہ کی کوشش نہیں کرتا اسے قرار نہیں آیا۔ مرتب)

- ایک مرید نے وصیت طلب کی تو فرمایا: تین خصلتوں کا خیال رکھنا۔

اوّل: کسی بداخلاق سے واسطہ پڑے تو اس کی بدخلقی کو اپنی خوش خلقی کے ذریعہ تبدیل کرنا، دوم: اگر کوئی احسان کرے تو اول اللہ کا شکر ادا کرنا، اس کے بعد محسن کا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کے دل کو مہربان کیا ہے، سوم: اگر مصیبت پیش آجائے تو فوراً اپنی عاجزی کا اقرار کرنا۔ (یہ تینوں کام ایسے ہیں، جو سیرت وکردار کی پاکیزگی اور بلندی سے تعلق رکھتے ہیں، جو اللہ کی راہ محبت کے لوازمات میں شامل ہیں۔ جب شخصیت ان صفات وخصوصیات کی حامل بنتی ہے، اس کے بعد ہی وہ درویش سے منسوب ہوتی ہے۔ مرتب)

- آپ سے پوچھا گیا: بندہ کمال کو کس وقت پہنچتا ہے، فرمایا، اس وقت جب وہ اپنے عیبوں کو پہنچانے اور مخلوق سے کسی قسم کی طمع نہ رکھے۔ (ہر وقت اپنے عیبوں کو پیش نظر رکھنا اور مخلوق سے طمع نہ رکھنا، یہ ایسی خصوصیات ہیں، جو تصوف کی ریاضتوں کا حاصل ہیں، لیکن یہ خصوصیات آخر وقت تک اندر میں ڈوبتے رہنے اور مسلسل خوداحتسابی سے کام لیتے رہنے کے نتیجہ میں برقرار رہتی ہے، ورنہ کسی بھی وقت فرد کے گرنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مرتب)

- پوچھا گیا متکبر کون ہوتا ہے؟ فرمایا، جسے ساری کائنات میں اپنا نفس زیادہ اچھا نظر آئے۔ (اپنے نفس اور اپنے آپ کو کامل اور پاکباز سمجھنا، تکبر کی علامت ہے، اور نااہلی کی بھی۔ نفس کی اصلاح کے جتنے مراحل طے ہوتے جاتے ہیں، طالب کو محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ سیاہ کار تو اس کا اپنا نفس ہے۔ درویشی وفقیری دراصل اپنے نفس کی پامالی ہی کا نام ہے۔ مرتب)

حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ

- پیر میں یہ پانچ صفات نہ ہوں تو وہ دجال ہے، پیر نہیں ہے۔ ایک یہ کہ پیر ظاہری شریعت کا عالم ہو، دوم وہ علم حقیقت سے آشنا ہو، سوم اپنے ساتھ آنے والوں کے ساتھ عمدگی اور خندہ پیشانی سے برتاؤ کرتا ہو اور مسافروں کو کھانا کھلاتا ہو۔ چہارم یہ کہ غربا اور بے حیثیت افراد سے قولاً وفعلاً عاجزی اور انکساری سے پیش آتا ہو۔ پنجم یہ کہ مریدوں کی باطنی تربیت وتعلیم کی صلاحیت رکھتا ہو اور خود ریا، حسد، طمع، خود بینی، غفلت اور عیش طلبی سے پاک ہو۔

(شیخ کو پرکھنے کے لئے یہ پانچ اہم صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان صفات کے بغیر فرد اور سب کچھ ہوسکتا ہے، لیکن شیخ نہیں ہوسکتا۔ یہ صفات فنائے نفس کے مقام تک رسائی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی اور فنائے نفس کا مقام غیر معمولی مجاہدوں کا متقاضی ہے۔ فنائے نفس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ فرد نفس کی معیت سے نکل کر اللہ کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ مخلوق کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ خدمت خلق اور خدمت دین اس کا وظیفہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی اس تک رسائی آسان ہوتی ہے، خلق کی اصلاح کے غم میں وہ گھلتا رہتا ہے، وہ مال بنانے اور پیر بننے کی فکر سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی خدمت کے لئے وقف ہوجاتا ہے، ہر وہ شخص جو حقیقی طلب کے ساتھ اس سے وابستہ ہوتا ہے، اس کی زندگی بدلنا شروع ہوجاتی ہے اور اس پر بتدریج اللہ کا رنگ غالب ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

جدید دور میں چونکہ عام طور پر یہ صفات مفقود ہیں، اس لئے اس دور میں پیری مریدی رسمی صورت اختیار کرچکی ہے۔ پیر اور اس کے مریدوں کے دل سے دنیا کی محبت نکلنے کی صورت

پیدا نہیں ہوتی۔ یہ پیری آزمائش ہے آزمائش۔ خام صوفی کو جب کچھ مرید مل جاتے ہیں تو وہ دولت کے خبط میں مبتلا ہوکر اپنی مالی حیثیت کو مستحکم کرنے لگتا ہے۔ مرتب)

- مجھے فرائض کے بعد محتاجوں اور مہمانوں کو کھانا کھلانے اور عام وخاص کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنے کے سوا کوئی بہتر کام معلوم نہیں ہوتا، اگر میں ساری دنیا کی دولت کا مالک ہوجاؤں تو وہ ساری کی ساری بھوکوں کو کھلانے اور محتاجوں کی مدد میں صرف کردوں۔

- کسی نے دریافت کیا، فقیر کی معنیٰ کیا ہیں۔ فرمایا ''ف'' سے مراد ما سوا اللہ سے دل کو فارغ کرکے ذات الٰہی میں فنا ہوجانا ہے۔ ''ق'' سے مراد اپنے قلب کو اللہ کی حب سے مستحکم کرنا اور اس کی رضامندی ورضا جوئی پر قائم ہوجانا ہے، ''ی'' سے مراد **یرجوا ربہ ویخاف اللہ** سے امیدوار ہونا اور دل میں اس کا خوف ہونا ہے اور ''ر'' سے مراد رقت قلب اور رجوع الی اللہ ہے۔ یعنی نفسانی خواہشوں سے دستبردار ہوکر اللہ کی طرف رجوع ہوجانا۔ (فقیر کی بہت عمدہ تشریح فرمائی گئی ہے، فقیر کی اس سے بہتر تشریح ہونہیں سکتی اس اعتبار سے فقیر ہونے کے دعویدار ہم لوگ اگر اپنا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ہم تو فقیر کے ابجد تک پہنچ نہیں سکے ہیں، فقیر بننے کے لئے طویل عرصہ تک سخت مجاہدوں کی ضرورت ہے، سارے اکابر بزرگ جو حقیقی فقیر ہیں، وہ ان مجاہدوں سے گزر کر ہی فقیر بنے ہیں۔ مرتب)

- اپنے دل کے دروازہ پر دربان بن جاؤ، جس کے جانے کا اللہ حکم دے، اس کو اندر جانے دو، جس سے روکے، اس سے رک جاؤ، دلوں کی خواہشوں کو زیادہ نہ بڑھاؤ، ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔

(اپنے دل کے دربان بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ کثرت ذکر کے نور سے جب دل بیدار ہوکر ہر گناہ اور ہر نیکی کے بارے میں فتویٰ دینے لگتا ہے تو اس کے اس فتویٰ پر عمل میں تاخیر سے ہرگز کام نہیں لینا چاہئے، ورنہ دل کے فتویٰ کا عمل رک جائے گا، نیکی پر دل خوش ہوتا ہے، گناہ پر وہ اذیت سے سرشار ہوتا ہے۔ دل کی مسلسل نگرانی کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

دل کے زبان بن جانے کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ دنیاوی کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے اگر دل کی توجہ ہٹنے لگے اور دل، معاملات میں زیادہ الجھنے لگے تو پھر فوراً دل میں غوطہ زنی کا عمل شروع کردینا چاہئے، تاکہ انوار الٰہی سے اخذ کی دل کی صلاحیت پھر طاقتور ہو سکے۔ مرتب)

- کسی حال اور مقام پر بھروسہ کرکے یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمیشہ اس (حال ومقام) پر قائم رہنا ہے، کیونکہ **کل یوم ھو فی شان** آیا ہے، تغیر وتبدیلی لازمی ہے۔

(اس ملفوظ میں اہم نکتہ بیان ہوا ہے، کہ کسی بھی حال اور مقام کو مستقل نہیں سمجھنا چاہئے، حالات وکیفیات میں ادل بدل آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ معرفت میں ارتقا کے نہ ختم ہونے والے مقامات طے ہوتے رہتے ہیں۔ جوں جوں فرد آگے بڑھتا ہے، اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پچھلی حالت تو موجودہ حالت سے زیادہ کمزور تھی، راہ محبت میں ادل بدل اللہ کی ایسی سنت ہے، جو سب کے ساتھ جاری رہتی ہے اور کوئی بھی اس سے مستثنا نہیں۔ مرتب)

- پوچھا گیا، بقا کیا ہے؟ فرمایا، بقائے رب ہے اور وہ حجاب نفس کی دوری کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور نفس کا حجاب دور نہیں ہوتا، جب تک کہ باہر کی دید سے نگاہ نہ اٹھائی جائے اور اپنے نفس کی دید میں مصروف نہ ہوا جائے۔

(یہاں بقا کی بہت عمدہ تشریح کی گئی ہے کہ جب نفسی حجابات دور ہوجاتے ہیں اور تزکیہ ہوجاتا ہے اور فرد اخلاق حسنہ کا حامل ہوجاتا ہے تو اسے بقا کی دولت عظمیٰ عطا ہوتی ہے۔ بقا کا مطلب قلب میں اللہ کے استحضار کا موجود ہونا ہے، ہر وقت اس کی فکر کا غالب ہونا ہے۔ بقا کی یہ حالت نفس کے خلاف شدید معرکہ آرائی کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ نفس کے خلاف معرکہ آرائی میں کامیابی اس وقت ہی حاصل ہوسکتی ہے، جب باہر کی دید سے نگاہ اٹھالی جائے، یعنی سارے تفکرات کو ایک ہی فکر محبوب کی فکر میں تبدیل کردیا جائے۔ سارے کاموں پر ذکر وفکر کے کام کو مقدم رکھا جائے۔ حالت فنا میں اندر میں غوطہ زنی اور احتساب نفس کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے، حالت بقا میں اس عمل میں استقامت نصیب ہوکر، بقائے رب کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ مرتب)

- عارفوں کو عظمت الٰہی کی ہیبت سے خوف ہوتا ہے اور یہ خوف کبھی زائل نہیں ہوتا، اس لئے کہ عارف کے سامنے عظمت رب کبھی زائل نہیں ہوتی۔

(یہاں عظمت رب کے سلسلہ میں عارفوں کے حالات کی بہت خوب نشاندہی فرمائی ہے کہ ان پر ہر وقت محبوب کی شان عظمت کا احساس غالب رہتا ہے۔ اور عظمت رب کے غلبہ کی وجہ سے ان پر خوف کی حالت غالب رہتی ہے، جو ہر وقت موجود ہوتی ہے اور کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اس خوف میں امید کی آمیزش بھی شامل رہتی ہے۔ مرتب)

- رجا (امید) کے بارے میں فرمایا، اولیاء اللہ کی رجا پروردگار کے ساتھ ایک حسن ظن ہے، جس کو نفع وضرر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اس رجا میں خوف بھی ساتھ لگا ہوا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر مومن کے خوف وامید کو تولا جائے تو دونوں کا وزن برابر ہوگا۔

- دنیا نے تجھ جیسے ہزاروں کو پالا اور موٹا تازہ کیا اور پھر خود ہی اپنی خوراک بنالیا۔

- مومن کے لئے سونا مناسب نہیں، جب تک اپنا وصیت نامہ سرہانہ نہ رکھے۔

- دنیا کو دل سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لو، یعنی دولت کماؤ، مگر اسے ہاتھ ہی میں رکھو، اسے دل پر قبضہ کرنے نہ دو۔ (تصوف کی ریاضتوں کے نتیجہ میں سب سے آخر میں جو چیز نکلتی ہے، وہ حب مال وحب جاہ ہے۔ مجاہدوں میں اگر کمی رہ گئی، فرد، فنا کے حقیقی مقام تک نہیں پہنچا اور بزرگی کے مقام پر فائز ہوا تو بزرگی کے روپ میں حب مال اور حب جاہ کے جذبات اس پر غالب آئے بغیر نہیں رہتے۔ مرتب)

- جس نے مخلوق کی طرف منہ کیا، اس نے خالق کی طرف سے پیٹھ پھیر دی۔ (مخلوق سے توقعات وابستہ کرنا اور ان سے مالی امیدیں وابستہ کرنا، یہ خام صوفی کی علامت ہے۔ مرتب)

- لوگوں کی نظروں میں اپنا وقار قائم رہنے دو، ورنہ افلاس کو ظاہر کرنے سے اہل دنیا کی نظروں میں گر جاؤ گے۔

- آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنے والے کے لئے دنیا وآخرت دونوں میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے والے کے لئے دونوں میں خرابی ہی خرابی ہے۔ (دنیا میں فتنہ وفساد اور افراد کی زندگیوں میں پیدا ہونے والی ساری خرابیوں کا بنیادی سبب ہی یہی ہے کہ دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی گئی ہے۔ اور ایسی فضا پیدا کردی گئی ہے کہ عام طور پر نہ فرد مادی خوشحالی اور چند دنوں کی چمک دمک کے لئے مجنون وار ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے چھینا جھپٹی، اور کسی، تصادم اور فساد کی ہمہ گیر فضا پیدا ہوگئی ہے۔ مرتب)

- جو مخلوق کا ادب نہیں کرتا، وہ خالق کا ادب کرنے کا دعویٰ نہ کرے اور جو اپنے نفس کو تعلیم نہیں دے سکتا، وہ دوسروں کو تعلیم دینے کی سعی نہ کرے۔ (اللہ کے بندوں سے اخلاق وآداب سے پیش آگے بغیر اللہ کے آداب کی بجا آوری مشکل ہے۔ یہ سارا کام ایسا ہے جس کا سارا تعلق نفس کو مہذب بنانے سے ہے۔ نفس کو مہذب بنائے بغیر دوسروں کو مہذب بنانے کی فکر لاحاصل ہے۔ دوسروں کی تعلیم وتربیت کا سارا تعلق اپنے آپ کو تعلیم وتربیت اور تہذیب سے آراستہ کرنے سے وابستہ ہے۔ مرتب)

- اخلاص اس چیز کا نام ہے کہ لوگوں کی تعریف یا مذمت کا کچھ خیال نہ کیا جائے۔ (لوگوں کی تعریف وملامت سے بے نیاز ہونا اور اس بے نیازی میں استقامت کا حاصل ہونا، یہ علامت ہے راہ سلوک میں پختگی کی، بلکہ راہ سلوک طے ہونے کی۔ یہ سعادت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ مرتب)

- اپنے لقمے کی اصلاح کر، اس لئے کہ نیک اعمال کی اصل بنیاد یہی ہے۔

- دولتمندوں کے ساتھ وقار وغلبہ سے ملو اور درویشوں کے ساتھ عجز وانکسار سے پیش آؤ۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

- راستہ چلنے والوں کے لئے اول راہ شریعت ہے۔ جب طالبان راہ شریعت میں رہیں اور ذرہ برابر تجاوز وتفاوت نہ کریں تو طریقت تک پہنچتے ہیں۔ پھر جب اس مرتبہ پر قائم ہوجاتے ہیں۔ اور فرمان طریقت سنت سابقین پوری طرح سے بجالاتے ہیں تو مرتبہ معرفت تک پہنچتے ہیں۔ اور جب اس مقام کی روشنی اور شناخت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور ثابت قدم ہوجاتے ہیں تو مرتبۂ چہارم یعنی حقیقت میں گذر ہوتا ہے۔ اس مقام کو طے کرنے کے بعد مراد حاصل ہوتی ہے۔ (اس ملفوظ میں محبوب سے وصال کی منزل تک رسائی کے لئے جو راہ طریق بیان فرمائی گئی ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ یہی ترتیب ہے جو درویشوں کے پیش نظر ہوتی ہے اس ترتیب کے ساتھ بتدریج چلتے رہنے کے نتیجہ میں ہی عرصہ کے بعد طالب اصل منزل تک پہنچتا ہے)۔

- بارگاہ خداوندی میں نماز سے قرب حاصل ہوتا ہے۔ نماز عبد ومعبود کے درمیان راز ہے۔ اور معراج المومنین ہے۔ (کثرت ذکر کے نتیجہ میں نماز سے انسیت پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح نماز، محبوب سے راز ونیاز کا سب سے اہم ذریعہ بن جاتی ہے)۔

- نماز میں جس قدر اطمینان، حضوری اور مشغولی ہو، اسی قدر قرب الٰہی حاصل ہو۔

- قرآن مجید کا دیکھنا ثواب، پڑھنا اور سمجھنا ثواب ہے، حرف پر نگاہ پڑے، دس بدیاں دور ہوں۔ اور دس نیکیاں درج ہوں۔ آنکھ کی روشنی بڑھے۔ اور آنکھ کی بیماریوں سے نجات ملے۔

- جس نے نعمت پائی سخاوت سے پائی۔

- حاجت روائی کے لئے الحمد شریف بکثرت پڑھنا چاہئیے۔

- بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلانا۔ غربا کی فریاد سننا اور حاجت روائی کرنا، درماندوں کی دستگیری کرنا، عذاب دوزخ سے بچنے کی بہترین تدابیر ہیں۔ (دوزخ سے بچنے کے سلسلہ

میں جن کاموں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ وہ بہت اہم نوعیت کے کام ہیں۔ بدقسمتی سے مادیت اور نفس پرستی کے عمومی غلبہ کی وجہ سے اس دور میں ان کاموں کی اہمیت باقی نہ رہی ہے، جس کی وجہ سے انسانیت کی عظیم اکثریت مسائل ومشکلات کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ مالدار، سرمایہ دار اور اہل اقتدار جو مادیت میں استغراق کی وجہ سے ان کاموں سے غافل ہیں، ان کے لئے خود اس دنیا کی زندگی جہنم کا منظر بن گئی ہے کہ ان کے دل وروح کا سکون رخصت ہوگیا ہے۔ جس سے بڑھکر دنیا میں کوئی عذاب نہیں ہوسکتا)۔

- جو ورد یا وظیفہ مقرر کیا جائے، وہ اگر دن میں نہ ہو سکے تو رات میں پڑھنا چاہئیے، ورد کا تارک لعنتی ہوتا ہے۔ (واضح ہوکہ راہ سلوک کے طالب اگر ذکر وفکر شروع کرکے نہ کریں گے تو ان کے دل پر حشر برپا ہوگا۔ اور ذکر سے محرومی والا دن ان کے لئے قیامت خیز ثابت ہوگا۔ مرتب)

- نیکوں کی صحبت نیک کام سے بہتر ہے۔ اور بدوں کی صحبت بدکام سے بدتر ہے۔

- حدیث رسول ہے کہ وہ شخص ضعیف ترین ہے، جو اپنی بات پر قائم نہ رہے۔

- گناہ اتنا نقصان نہیں پہنچاتا، جتنا مسلمان بھائی کو ذلیل وخوار کرنا۔

- قبرستان میں کھانا پینا اور ہنسنا نہیں چاہئیے۔ کیونکہ یہ مقام عبرت کا ہے۔ اور جو ایسا کرتے ہیں، وہ سنگدل اور منافق ہوتے ہیں۔

- بدبختی کی علامت یہ ہے کہ گناہ کرکے امید وار قبولیت رہے اور گناہ کو ہیچ سمجھے۔

- خود پرستی ونفس پرستی ہی دراصل بت پرستی ہے۔ اس کو ترک کرنیکے بعد خدا پرستی کی منزل شروع ہوتی ہے۔ (اہل اللہ کی نظر میں بندہ مومن کا کام خود پرستی ونفسی پرستی کی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی ہی سے شروع ہوتا ہے، اس کے بغیر دین کے نام پر جو بھی کام ہوگا، اس میں نفسی قوتوں کی آمیزش شامل ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ (مرتب)

- بغیر تربیت مرشد منزل پر رسائی مشکل ہے۔ (اہل اللہ کی صحبت وتربیت کے بغیر نفس کا ہمالیہ پہاڑ، طے کرنا مشکل ہے، لیکن اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ نفس سے معرکہ آرائی کے مراحل طے کئے بغیر بزرگی کی مسند سجائی گئی ہے، ظاہر ہے ایسے خام مرشد جو اپنی تربیت نہیں کرسکتے، اپنے آپ کو دنیا سے نہیں بچا سکتے، وہ دوسروں کی تربیت کیسے کرسکیں گے۔ مرتب)

- سب وقتوں میں عمدہ وقت وہ ہے، جو وسوسوں اور خطرات سے پاک ہو۔
(راہ سلوک کا سفر وسوسوں سے شروع ہوتا ہے، آخر میں جاکر وسوسے قطع ہوجاتے ہیں۔ مرتب)

- دنیا میں دو چیزیں خوشتر ہیں۔ صحبت فقراء اور حرمت اولیاء۔

- اللہ کا دوست وہ ہے، جس میں تین اوصاف ہوں۔ سخاوت دریا جیسی۔ شفقت آفتاب کی طرح اور تواضع زمین کی مانند۔

- دوستی نام ہے، دل سے ذکر کرنے کا، دل، ذکر ہی کے لئے بنایا گیا ہے۔ (دل کی تصویر اور اس کا نقشہ اللہ کے نام پر ہی بنایا گیا ہے۔ طبی کتابوں میں دل کی تصویر دیکھیں گے تو اس پر ڈزائین سے اللہ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لئے ہر انسان کے دل کی غذا ہی اللہ اللہ کرنا ہے، دل کو جب اللہ اللہ کی غذا نہیں ملتی تو دل مردہ ہوجاتا ہے اور وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے، امت کے بڑے بزرگ کی طرف سے دل سے ذکر کرنے کی تلقین ہمارے لئے بیدار ہونے کا ذریعہ ہونا چاہئے۔ مرتب)

- بندہ مومن تین چیزوں کو دوست رکھتا ہے۔ یکم فقر وفاقہ۔ دوم بیماری اور سوم موت۔ (جو بندہ ان تینوں خصوصیات وسعادتوں کا حامل ہوجائے، اس کی سعادت کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ مرتب)

- جس کو اللہ دوست رکھتا ہے، اس پر بلا نازل ہوتی ہے۔ (اللہ کے دوستوں پر مصیبت، تکلیف، بیماری، افلاس وغیرہ یہ ان پر محبوب کا انعام اور تحفہ ہوتا ہے، جس کے ذریعہ انہیں مستحکم کیا جاتا ہے اور محبوب کے وصال تک پہنچایا جاتا ہے۔ مرتب)

- عارف کے لئے تین ارکان ضروری ہیں ہیبت۔ تعظیم اور حیا۔ گناہوں سے شرمندہ ہونا ہیبت ہے۔ طاعت کرنا تعظیم ہے اور اللہ کے سواء کسی پر نظر نہ ڈالنا حیا ہے۔

- سب سے پہلی چیز جو انسان پر فرض ہوئی، وہ معرفت ہے، جیسا کہ الا لیعبدون سے ظاہر ہے۔ (معرفت کے بغیر خود شناسی و خدا شناسی حاصل نہیں ہوتی۔ مرتب)

- توبہ کے چند مقام ہیں۔ جاہلوں سے دور رہنا۔ باطل کو ترک کرنا۔ منکروں سے روگردانی کرنا۔ محبوب سے محبت رکھنا، خیرات کرنا۔ توبہ کو درست کرنا اور مظالم کو رد کرنا۔

- جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ دشمنی رکھتا ہے، ان سے دشمنی رکھنا ضروری ہے۔ (یعنی

دنیا ونفس سے دشمنی اس کے بغیر اللہ کی دوستی حاصل نہیں ہوتی۔ دنیا ونفس کی دشمنی کے بغیر فرد راہ سلوک میں چل ہی نہیں سکتا، جب بزرگی کے نام پر دنیا آجائے تو سمجھنا چاہیے تو بزرگ محبوب کے عتاب کا شکار ہوا ہے۔(مرتب)

- اہل معرفت کی عبادت پاس انفاس ہے۔ (اہل معرفت کے ہاں اللہ کے اسم ذات کے ذکر کی اہمیت یہ ہے کہ جو سانس خارج ہو، اس میں بھی اللہ کا ذکر ہوتو جو سانس اندر جائے وہ بھی ذکر سے خالی نہ ہو، اسی کو پاس انفاس کہتے ہیں بعض بزرگوں کے نظر میں لاالہ الا اللہ کا ذکر اس طرح ہو کہ کوئی سانس اس ذکر سے خالی نہ ہو۔مقصود دل کی نگرانی کرنی ہے کہ وہ اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہو۔

اس دور میں تصوف سے وابستہ افراد کی بہتر اصلاح نہ ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ پاس انفاس کی عبادت سے غفلت کا مظاہرہ ہورہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اہل معرفت کی ساری عبادت کی جان اور سیرت وکردار کی تعمیر کی بنیاد ہی کثرت ذکر سے وابستہ ہے، سبب یہ ہے کہ اللہ کی تجلیات ہی فرد کو مادی دنیا اور خواہشات سے بلند کرکے ملکوتی صفات کا حامل بناتی ہے)۔

- خواجگان چشت میں بعض نے پندرہ درجہ سلوک کے مقرر کئے ہیں۔ اور ان میں سے پانچواں کشف وکرامات کا ہے۔لیکن جب تک کل پندرہ درجے طے نہ ہوں، اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنا چاہئے۔ (یعنی سلوک کی پوری طرح تکمیل کے بغیر بزرگی کے مقام پر فائز نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس صورت میں نفس غالب ہوگا اور بزرگی، فتنۂ نفس کا ذریعہ بن جائے گی۔مرتب)

- اہل سلوک میں محبت ایک ایسا علم ہے کہ لاکھوں علماء اس کو سمجھنا چاہتے ہیں، مگر انہیں اس کی ذرہ برابر بھی خبر نہیں ہوتی۔ (اللہ کی محبت کے ارتقائی مراحل طے کئے بغیر علم نافع نہیں ہوتا، دنیا میں اللہ سے والہانہ محبت ہی سب سے بڑا انعام ہے، لیکن اللہ کی محبت کچھ عرصہ کے لئے علم وعقل سے دستبرداری کی قیمت پر ہی حاصل ہوسکتی ہے، اس لئے کہ علم وعقل، محبت کو قیل وقال کے ذریعہ سمجھنا چاہتے ہیں، جو ممکن نہیں۔مرتب)

- عارف کے لئے یہ ایک ادنیٰ بات ہے کہ ملک ومال سے بیزار ہوجائے۔

(عارف کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ مال ودولت سے دستبردار ہوجائے، اس کے بغیر عارف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔مرتب)

- اہل عرفان، یاد خدا کے سوا اور کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے۔ (عارفوں کو محبوب کے ذکر اور محبوب کی باتوں کے علاوہ دوسری باتوں سے اذیت ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ محبوب کے ذکر کے ذریعہ ایسی حلاوت سے آشنا ہوتے ہیں، جس کا بدل دنیا کی کوئی حلاوت نہیں ہوسکتی۔مرتب)

- عارفوں کی خصلت محبت میں اخلاص ہے۔

(محبت، جب اخلاص سے سرشار ہوجاتی ہے اور اس میں نفس کی ساری ملاوٹیں ختم ہوجاتی ہیں تو طالب کا کام بن جاتا ہے۔(مرتب)

- متوکل وہ ہے، جو خلقت سے آزار ورنج پہنچ جانے پر شکایت وحکایت نہ کرے۔

(لوگوں سے تکلیف پہنچنے پر صبر سے کام لینا، بلکہ انہیں دل سے معاف کرنا اور ان کے لئے دعا کرنا، یہ بڑا مقام ہے، جو مجاہدوں اور اللہ کے فضل خاص ہی سے عطا ہوتا ہے۔مرتب)

- یقین وہ نور ہے، جس سے بندہ منور ہوجاتا ہے۔

- عاشق کا دل آتشکدۂ محبت ہے، اس میں جو آئے، اسے جلاکر خاک کردیتا ہے، کیونکہ عشق کی آگ سب آگوں سے تیز ہے۔(عارف آتش عشق سے سرشار ہوتا ہے، عشق کی منافی ساری چیزیں اس میں جل جاتی ہیں، اس طرح عاشق خالص محبوب کا بن جاتا ہے۔مرتب)

- دوست کے اسرار حسین ہوتے ہیں، اس لئے عاشق کے دل میں قیام کرتے ہیں۔

- حق (اللہ تعالیٰ) کی دوستی کی خاطر دونوں جہاں لٹا دینا آسان ہے۔

- دل وہ ہے جو اپنے حال سے خالی ہو۔ اور مشاہدہ حق میں باقی ہو۔

- عارف وہ ہے، جس کو رات کی بات یاد نہ ہو۔ (یعنی عارف پر محبوب کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کا دل دنیاوی باتوں کا متحمل نہیں ہوتا۔مرتب)

- عارف اس وقت تک روتا ہے، جب تک کہ راہ میں ہوتا ہے، جب حقائق کے قریب پہنچتا ہے اور اسے وصال حاصل ہوجاتا ہے تو گریہ نہیں کرتا۔

(وصال کے مقام کے حصول کے بعد عاشق میں ٹھیراؤ آجاتا ہے، اس سے پہلے وہ سراپا آنسو بن جاتا ہے۔ مرتب)

- عشق ومحبت میں گفتگو، حرکت اور مشغلہ اس وقت تک ہوتا ہے، جب تک کہ باہر رہیں۔ جب اندر داخلہ ہوتا ہے تو خاموشی، سکوت اور آرام میسر ہوجاتا ہے اور فریاد وشور باقی نہیں رہتا۔ (جب طالب راہ عشق میں داخل ہوکر، مجاہدوں سے کام لیتا ہے اور کچھ آگے چلتا ہے تو وہ سراپا جہد بن جاتا ہے اور سکینت سے سرشار ہوجاتا ہے اور اس کی قیل وقال ختم ہوجاتی ہے اور بے خودی کی حالت میں بھی کمی آنا شروع ہوجاتی ہے۔

-علم دریائے محیط ہے۔ اور معرفت دریائی لہر ہے۔ علم اللہ کو ہے اور معرفت بندے کو۔ لہذا بندہ خدا نہیں بن سکتا۔ (ماخوذ: سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ تصنیف: وحید احمد مسعود، صفحہ ۲۸۸ تا ۲۹۳)

حضرت فرید الدین شکر گنجؒ

- فقراء، اہل عشق ہیں اور علماء اہل عقل، لیکن کامل وہی ہیں، جن میں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں۔

- اپنا معاملہ صرف اللہ کے ساتھ رکھو، اس لئے کہ سب لیتے ہیں، جب کہ وہ دیتا ہے اور جو وہ دیتا ہے، اسے کوئی نہیں لے سکتا۔

- درویشی کا کوئی مقام ایسا نہیں، جو خوف وامید سے خالی ہو۔ (خوف وامید ایسی چیز ہے جس سے درویش زندگی بھر نکلنے نہیں پاتا، اس پر کبھی خوف کا غلبہ طاری رہتا ہے، جو اسے لرزا دیتا ہے تو کبھی اس پر امید کا پہلو غالب ہوتا ہے، جو اس کے دل کو محبوب پر اعتماد سے سرشار کردیتا ہے۔ درویش موت تک انہی دوحالتوں کے درمیاں ہی رہتا ہے۔ مرتب)

- فقیر کے لئے سب سے مضر شے دولتمند کی صحبت ہے۔ (عالم ربانی کی دولت کے بارے میں یہ تلقین کہ وہ سب سے زیادہ مضر ہے اور اس سے بچ کر رہنا چاہئے، اس تلقین سے معلوم ہوتا ہے کہ خاصانِ خدا کا منصب ہی ایسا ہے کہ اس منصب کے ساتھ دنیاوی تفکرات اور شان ومان کی طرز معاشرت، ان کے شان کے منافی ہے، ایسا کرنے سے وہ ملعون دنیا کے اثرات سے بچ سکیں، مشکل ہے، خاصان خدا کے علاوہ دوسرے لوگوں کی بات جدا ہے کہ وہ اگر اس کے لئے توانائیاں خرچ کرتے ہیں اور دولت جمع کرتے ہیں تو اس کے اثرات ان کی ذات تک محدود رہتے ہیں، لیکن خاصان خدا کا دولت کی طرف طبعی رجحان وہ ان کے حلقہ سے وابستہ افراد کے پورے رخ کو بدلنے کا موجب بن سکتا ہے۔)

- آسودگی کی خواہش ہو تو حسد سے دور ہو۔

- درویشی، پردہ پوشی کا معاملہ ہے اور درویش کو ان چار چیزوں سے بچنا چاہئے۔ اول لوگوں کے عیب تلاش نہ کرے۔ دوم جو باتیں سننے کے لائق نہیں، وہ نہ سنے، جو کہنے کے لائق نہیں، وہ نہ کہے اور جہاں جانا مناسب نہ ہو، وہاں نہ جائے۔ (درویش کی جو خصوصیات بیان کئی گئی ہیں، وہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ درویش کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے عیب تلاش کرنے کی بجائے اپنے نفس کے احتساب میں مصروف ہوتا ہے، وہ احتساب نفس کے معاملہ میں زیادہ حساس ہوتا ہے، وہ جتنا زیادہ اپنے نفس کا احتساب کرتا ہے، اسے اپنی نئی نئی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا علم ہوتا رہتا ہے، غیرضروری باتوں سے اس کے دل میں تکدر ہوتا ہے۔ دوسروں کے غیرضروری تذکرہ کے بارے میں بھی وہ حساس ہوتا ہے۔ ایسی محفلیں اور مجلیس جہاں وقت کا ضیاع ہو، وہاں جانے کا وہ روادار نہیں ہوتا۔

درویش کی یہ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں، جو راہ سلوک میں چل کر فنا سے حالت بقا میں آنے کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ مرتب)

- اگر لوگوں کو علم (یعنی معرفت) کی قدر وقیمت کا پتہ چل جائے تو سارے کام چھوڑ کر معرفت کے پیچھے لگ جائیں۔

- مومن کا دل پاک زمین کی طرح ہے، اگر اس میں محبت کا بیج بویا جائے تو قسم قسم کی نعمتیں پیدا ہوتی ہیں۔

جب تک تو سانپ کی طرح کینچلی نہ نکالے، محبت حق کے دعویٰ میں صادق نہیں ہو سکتا۔

- جو شخص اللہ سے جتنا غافل ہوگا، وہ اتنا ہی زیادہ دنیا میں مبتلا ہوگا۔ (اللہ کے ذکر سے غفلت اپنے ساتھ دنیا کے تفکرات لاتی ہے اور مال ودولت کے بارے میں حساسیت

پیدا کرتی ہے، اس غفلت میں جتنا اضافہ ہوگا، اسی مناسبت سے فرد پر دنیا کا رنگ غالب ہوگا، دنیا کے رنگ کو زائل کرنے کے لئے کثرت ذکر سے زیادہ کوئی چیز مفید ومؤثر نہیں۔ مرتب)

- دردومعیت ورنج عاشقوں کی خوراک ہے، جس دن ان پر کوئی رنج وغم طاری نہیں ہوتا، اس دن انہیں فکر دامنگیر ہوتی ہے کہ دوست نے یاد نہیں کیا۔ جب دوبارہ رنج وغم وتکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں تو شکر ادا کرتے ہیں کہ دوست نے یاد کیا ہے۔ (محبوب کے لئے غم زدگی درویشی کا لازمی حصہ ہے۔ درویش ہر کام کے وقت محبوب کی رضامندی کو دیکھتا ہے۔ اس معاملہ میں اس سے معمولی کوتاہی بھی واقع ہوجاتی ہے تو وہ محبوب کی ناراضگی کے خطرہ سے رنجیدہ ہوجاتا ہے۔ رنج وغم اور قبض وبسط تو راہ محبت کا حصہ ہے۔ راہ محبت کو انہی چیزوں سے سجایا گیا ہے، یہ وہ زیور ہے جو محبّ کا سرمایہ ہے۔ مرتب)

- آتش عشق وہ آگ ہے، جو درویش کے دل میں ہی داخل ہوسکتی ہے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ

- یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ فرد آلائش نفسانی بھی رکھے اور اللہ کی بارگاہ میں باریاب بھی ہو۔

- جو درویش، خالق کے لئے نہیں، بلکہ خلق کے لئے عمدہ لباس پہنے، وہ راہ سلوک کا رہزن ہے اور جو نفس کے لئے اچھا کھانا کھائے، وہ جھوٹا اور خود پرست ہے، جو امرا کے ساتھ بیٹھتا ہے، وہ مرتد طریقت ہے اور جو نفس کے لئے خوب سوتا ہے، اسے اس نعمت سے کچھ نہیں ملا۔

- جو اولیا، اسرار الٰہی کو ظاہر کردیتے ہیں، وہ غلبہ شوق سے مجبور ہوکر ایسا کرتے ہیں اور بعض پختہ اولیا کسی حال میں بھی بھید ظاہر نہیں کرتے۔

- اہل معرفت کے لئے بلائے دوست رضائے دوست ہے۔

- درویش کا فاقہ اس کے اختیار میں ہے اور اسے دنیا دی گئی ہے کہ جس طرح چاہے خرچ کرے، وہ اپنے لئے بھی خرچ کرسکتا ہے، مگر وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ دوسروں کو دیتا ہے اور خود فاقہ کرتا ہے، جس سے اس کے کام میں ترقی ہوتی ہے۔

- جو محبت کا دعویٰ کرے اور مصیبت کے وقت چلائے، وہ جھوٹا ہے۔

- انسان کے لئے بُری صحبت سے بڑھکر کوئی چیز (خطرناک) نہیں۔

- فرد جب تک دنیا میں مشغول رہتا ہے، وہ خدا رسیدہ نہیں ہوسکتا۔ (دنیا میں مشغولیت سے ذکر سے توجہ ہٹتی ہے، اس لئے متوسط صوفی ذکر کے ملکہ کو مستحکم کرنے کے لئے عبوری عرصہ میں دنیاوی مصروفیات کو قطع کرکے، ذکر وفکر کے ملکہ کو مستحکم کرنے میں زیادہ وقت صرف کرتا ہے۔ مرتب)

- درویش کو راہ سلوک میں روزانہ ایک لاکھ ملکوں سے گزرنا چاہئے، پھر بھی اس کا قدم آگے ہی بڑھنا چاہئے۔ (درویش ہر طرح کے حالات میں محبوب کی طرف پیش قدمی کرتا رہتا ہے۔ اس کا سونا اور اس کے دنیاوی کام بھی عبادت میں ہی شمار ہوتے ہیں، اس پر محبوب سے غفلت طاری نہیں ہوتی۔ مرتب)

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ

جس نے گناہ چھوڑ کر (یعنی اسے جس حالت تکلیف میں مبتلا کیا گیا ہے) اس حالت پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین کیا، وہی امام ہے، خواہ اس کے پیرو تھوڑے ہوں۔

جب تک بندے کے ساتھ خواہشوں میں سے کوئی خواہش اور اپنی مرضیات میں سے کوئی مرضی موجود ہے، تب تک وہ اللہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

جو پرہیزگاری تمہارے دلوں میں علم ونور پیدا نہ کرے، اس کا اجر شمار نہ کرو۔

- جس بُرائی کے بعد خوف اور اللہ کی طرف رجوع ہو، اس کا کوئی وبال وحساب نہ ہوگا۔

- چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے علم کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ دنیا کی محبت، آخرت سے غفلت، افلاس کی دہشت اور آدمی کی دہشت (یعنی کسی فرد کا خوف)۔ (یہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ اللہ کی محبت اور راہ عشق میں داخل ہوئے بغیر ان سے نجات ممکن نہیں۔ محض علم سے ان بیماریوں سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوسکتا۔ مرتب)

- دو نیکیاں ایسی ہیں کہ ان کے ساتھ اگر گناہ ہوں تو ضرر نہیں ہوتا، ایک قضائے

الٰہی پر رضامندی۔ دوسرے اللہ کے بندوں سے درگذری۔

- جو کامل ہوتے ہیں،وہ اوصاف حق کے بھی حامل ہوتے ہیں اور خُلق کے صاحب بھی۔خُلق کے اعتبار سے انہیں دیکھوگے تو بشر کے اوصاف نظر آئیں گے اور اگر حق کی حیثیت سے دیکھوگے تو ان میں حق کے اوصاف پاؤگے۔ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کی پیروی سے تمہیں ان کے ظاہر میں فقر اور باطن میں غنا نظر آئے گا۔ (ظاہر میں فقر اور باطن میں غنا تکمیل سلوک کے بغیر حاصل ہو،مشکل ہے،تکمیل سلوک کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ دل سے دنیا کی محبت نکل جائے، اسلامی شریعت مزاج کا حصہ بن جائے، ہر معاملہ میں مخلوق کی طرف دیکھنے کی بجائے محبوب حقیقی کی طرف دیکھنے کا مزاج مستحکم ہوجائے۔ ذکر اور راہ سلوک کے مراقبہ جات میں یہ خصوصیات موجود ہیں کہ اس سے فرد کی نفسی قوتوں پر روحانی قوتیں غالب آجاتی ہیں اور زہد، فقر، دنیا سے استغنا، قناعت، توکل اور صبر وشکر کی صفات غالب ہوجاتی ہیں۔

جہاں ایسا نہ ہو اور بزرگی کے باوجود شہرت اور دنیا کا رنگ غالب ہو، وہاں یہ سمجھا جائے گا کہ ذکر ومراقبہ جات پر مطلوبہ مجاہدہ سے کام نہیں لیا گیا، جس کی وجہ سے نفسی قوتیں وخواہشات مضمحل نہ ہوسکیں اور بزرگی کی مسند پر وقت سے پہلے فائز ہونے کی حماقت سرزد ہوئی۔ مرتب)

مولانا رومیؒ

- دانا کی زیارت عبادت ہے، جس سے نیک بختی کے دروازے کھلتے ہیں۔

- بہت سے ابلیس، انسان کی صورت پر ہیں، لہٰذا ہر ایک کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہ دو۔ (یہاں یہ نکتہ بیان کیا گیا کہ بزرگی کے روپ میں دنیادار افراد موجود ہوتے ہیں، ان کا مقصد مال ودولت کا حصول ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں سے بظاہر چاہے ہی کتنی عقل سے ماوریٰ چیزیں صادر ہوں، لیکن ان کی مال ودولت سے وابستگی کی بیماری ایسی ہے، جو ان کی بزرگی کو باطل کردیتی ہے، ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینا سراسر خسارہ ہے۔ مرتب)

- اگر ہماری جان یادِ خدا میں بیدار نہیں تو یہ بیداری ہمارے لئے قید خانہ ہے۔

- جب بڑوں کی قسمت میں درد ورنج ہے تو چھوٹے اس سے محفوظ کیسے رہ سکتے ہیں اہل معرفت کا علم انہیں اوپر اٹھاتا ہے اور انہیں بلند کرتا ہے۔جب کہ اہل تن (یعنی پیٹ پرست) کے علوم ان کے لئے بوجھ ہیں۔

- فقیر کا دو ایک دن کے لئے امتحان کرنا کہ اس میں دگنی بے نیازی دیکھے۔ (یہاں حقیقی فقیر ودرویش کی نشاندہی کی گئی کہ ان کے ساتھ رہوگے تو دنیا سے ان کے استغنا کی حالت کو دیکھو گے، اگر اس میں دنیا سے بے نیازی کی حالت موجود نہیں، وہ مال ودولت سے کھیلتا ہے، بنگلوں میں رہتا ہے، پہروں میں رہتا ہے تو ایسا فرد حقیقی درویش نہیں ہو سکتا، جہاں تک اس کی شہرت، اور مریدوں کی کثرت کا تعلق ہے تو یہ اس کے لئے آزمائش ہے، زندگی کی علامتیں تو وہ صفات ہیں جن کا ذکر اکابر بزرگوں نے کیا ہے۔ مرتب)

- اے پیاری عمر، ہم غذا میں مٹی کھاتے رہے، سو آخر کار ہمیں مٹی نے کھالیا۔

- اگر تو راستہ نہیں جانتا تو جو کچھ نفس کہتا ہے تو اس کا الٹ کر، کیونکہ وہی سیدھا راستہ ہے۔

متفرق

- دل کی صلاحیتوں کا چار چیزوں پر دارو مدار ہے، اللہ سے والہانہ محبت، غیر اللہ سے فرار، مراقبہ اور تواضع۔ (عثمان الجسیری)

- اپنے عیوب کسی کو نظر نہیں آتے، سوائے اس شخص کے، جو ہر وقت اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے۔ (عثمان الجسیری)

اہل قلوب کی صحبت اور ان کی دوستی اس وقت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے، جب ان کی صحبت کے آداب سے آگاہی ہو اور ان آداب کی پوری رعایت کی جائے، ورنہ خطرہ کا باعث ہے۔ (ناصر الدین عبیداللہ)

- علم وہ ہے، جس سے دنیا حقیر دکھائی دے اور آخرت کی فکر میں اضافہ ہو، دنیا کی خرابیاں واضح ہوجائیں اور بُرے اخلاق سے نجات حاصل ہو۔ (امام غزالی)

- جب اللہ تعالیٰ کسی سے مواخذہ کرتا ہے تو اسے اپنے کاموں سے الگ کرکے نفس کے کاموں میں لگا دیتا ہے۔(معروف کرخی) (اللہ کی پکڑ کی علامت یہ ہے کہ فرد پر شب وروز نفسی کاموں کا غلبہ رہنے لگتا ہے۔ مرتب)

- جو فرد اپنے نفس سے مطمئن ہے، وہ سب سے زیادہ ہلاکت کے خطرہ

سے دوچار ہے۔ (احمد بن عاصم) (محاسبہ نفس کا کام آخری وقت تک جاری رہتا ہے۔ مرتب)

- دل کو زندہ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دل کو ہمیشہ شکستہ رکھا جائے اور حرص سے بچایا جائے۔ (عبداللہ خبیق)

(ٹوٹا ہوا دل اور سارے مجاہدوں کے باوجود کچھ بھی نہیں ہونے کے احساس کا ہونا بڑی نعمت ہے، یہی ٹوٹا ہوا دل محبوب کو پسند ہے۔ مرتب)

- جو اللہ سے جتنی زیادہ محبت کرتا ہے، اسے اتنی زیادہ آزمائشوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ (یوسف بن الحسین) (اللہ سے محبت اور آزمائش ایک دوسرے کا لازم ملزوم حصہ ہیں، آزمائشیں اس لیے آتی ہیں، تاکہ طالب کو مستحکم تر کیا جائے۔ مرتب)

- محبت میں مصیبت اس لئے ہوتی ہے، تاکہ ہر کمینہ اس کی دعویٰ نہ کرے۔ (حضرت محبوب الٰہی) (ہر وہ فرد جو دنیا میں غلطاں ہے یا خواہشات نفس کا عادی ہے، اس کے لئے اللہ کی محبت کے راستے بند ہوتے ہیں، جب تک اس کے دل میں حقیقی طلب پیدا نہ ہو۔ مرتب)

- اہل محبت اور حق کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا (اس لیے کے اہل محبت ذکر فکر کے غیر معمولی مجاہدوں سے حجابات کو قطع کر دیتے ہیں۔ مرتب)

- کسی کا بُرا چاہنے والا ہمیشہ خود مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ (معروف کرخی)

- انسانوں میں سب سے زیادہ ذلیل وہ درویش ہے، جو دولتمندوں کی خوشامد کرے۔ (عبداللہ محمد مغربی)

(دولتمندوں سے قرب کے حصول اور دولتمند بننے کی تمنا سے بچنا سب سے دشوار کام ہے، اس کے لیے مجاہدوں کے ساتھ ساتھ زندگی بھر محتاط ہونے کی ضرورت درپیش ہے۔ مرتب)

- جو شخص یہ خواہش رکھے کہ لوگ اسے جانیں، اسے آخرت کی حلاوت نصیب نہ ہوگی۔ (بشر حافی)

(جذبہ شہرت سب سے بڑی آفت ہے، اللہ کے فضل خاص اور غیر معمولی مجاہدوں کے ذریعے نفس کی آخری حد تک فنائیت کے بغیر اس سے بچنا ممکن نہیں۔ مرتب)

- جب تک فرد اپنے اور نفس کے درمیاں دیوار کھڑی نہ کرے، وہ نیاز اور نماز کی لذت سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ (اپنے اور نفس کے خلاف دیوار کھڑے کرنے کا کام ان تھک اور مستقل جدوجہد کا متقاضی ہے۔ مرتب)

- بخیل کو دیکھنے سے فرد کا دل سخت ہوجاتا ہے۔

- امیروں کی تواضع کرنا فقیروں کے ساتھ دیانت ہے اور فقیروں کی تواضع کرنا، امیروں کے ساتھ خیانت ہے۔ (فقیر کی تواضع کے بغیر امیر کا غرور پاش پاش ہو، ممکن نہیں اور فقیروں کی طرف سے امیروں کی غیر معمولی تواضع کرنا، یہ فقیروں کے داعیۂ فقر کے لیے مضر ہے۔ مرتب)

- جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہوتا ہے تو اس میں حکمت پیدا ہوتی ہے۔ (حکمت اور دانائی کا تعلق دل کو دنیا کی محبت سے آخری حد تک خالی کرنے سے وابستہ ہے، اس کے بغیر دل میں حکمت کے موتی اگ سکیں، مشکل ہے۔ مرتب)

- عارف کے ستر مقام ہیں، ان میں سے ایک اس جہاں کی مرادوں کا نصیب نہ ہونا ہے۔ (حضرت نظام الدین اولیا)

(عارف جب تک دنیا اور اہل دنیا سے استغنا کے مقام پر فائز نہیں ہوتا، اس کا کام نہیں بن سکتا اور وہ عرفان کے مطلوبہ مقام پر فائز نہیں ہوسکتا، اس صورت میں اسے عارف کہنا ہی غلط ہے۔ مرتب)

- جب بندہ محض اللہ کے لئے کسی ادنی چیز کو چھوڑ دیتا ہے تو اسے اس سے بہتر شے ضرور ملتی ہے۔ (اللہ کی یہ سنت ہے کے نفس اور دنیا سے دستبردار ہوکر اللہ کا ہوجانے، کے نتیجے میں فرد پر انعامات کی بارش ہونے لگتی ہے۔ مرتب)

مشکلات ومصائب سے بھرپور زندگی کا

سفر کیسے طے ہو؟

زیرنظر مضمون ایک ساتھی کے حالات کو پیش نظر رکھکر، ان کے نام خط کی صورت میں لکھا گیا ہے، اب اسے مضمون کی شکل دیتے ہوئے ان ساتھی کا نام حذف کیا گیا ہے، یہ خط یا مضمون دراصل ہم میں سے ہر فرد کے مصائب ومشکلات سے نکلنے کا ایک لائحہ عمل ہے، بالخصوص موجودہ دور میں احساس کی تیزی، مادیت کی طوفانی لہروں کی شدت کی وجہ سے افراد کی نفسیات میں جو فساد پیدا ہوا ہے، جس نے گھروں، خاندانوں اور افراد کی زندگی میں زہر سرایت کیا ہے۔

زیرنظر مضمون میں افراد کو اس بحران سے نکل کر، معتدل زندگی گذارنے کا راستہ دکھایا گیا ہے۔ اللہ کرے یہ مضمون ہم سب کے لئے اللہ کے ذکر وفکر کے ذریعہ احساس کی پاکیزگی کے کام کے سلسلہ میں متحرک ہونے کا ذریعہ ثابت ہو۔

سب سے پہلی، بنیادی اور آخری بات یہ ہے کہ ذکروفکر کے مجاہدوں سے کام لیا جائے، اس کے بغیر نفسی قوتوں پر روحانی قوتیں غالب نہیں آسکتی، مجاہدے کسی پر بھی معاف نہیں، تصوف نام ہی مجاہدوں کا ہے، آدھے گھنٹہ کے مراقبہ سے دل وروح کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے، بالخصوص راہ سلوک میں برسوں سے چلنے والے طالب کے آدھے گھنٹے کا مراقبہ اس کی تشفی کے لئے بالکل ناکافی ہے، ۲۴ گھنٹوں میں کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے کا مراقبہ کرنا چاہیے، اس دنیا میں آنے کا مقصد ہی مجاہدے کرکے، نفس کو مہذب بنانا اور اللہ ورسول کے تابع کرنا ہے۔

مراقبہ میں محنت سے جو فائدے ہونگے، وہ یہ ہیں: ہر معاملہ کے منفی پہلو پر مثبت پہلو غالب ہوتا جائے گا، اللہ کی نعمتوں پر شکر ادائیگی کا احساس بڑھتا جائے گا کہ اللہ نے اپنے فضل خاص سے مجھے بے شمار افراد سے زیادہ بہتر حالت میں رکھا ہے، میں خوشحال ہوں، جبکہ اللہ کے بے شمار افراد کو روٹی تک مشکل سے میسر ہوتی ہے، مراقبہ کی کثرت، ناشکری کی طرف جانے نہیں دے گی۔

مراقبہ، فرد کو مایوسی سے بچاکر، ہمت وحوصلہ اور صبر وشکر کے ساتھ زندگی گذارنے کا عادی بنادے گا، مراقبہ، طبیعت میں اعتدال ٹھراؤ پیدا کرے گا، مراقبہ، مزاج میں مبالغہ آرائی، معمولی چیز کا بہت زیادہ اثر لینے سے بچانے میں اہم کردار ادا کرے گا، مراقبہ، ظرف میں اتنی وسعت پیدا کرے گا کہ مادی نفع ونقصان سے بلندی کی صورت پیدا ہوجائی گی۔

لاشعور میں تصوف کے بارے میں یہ تصور کہ کسی بزرگ سے وابستگی کے نتیجہ میں یہ دنیا ازخود جنت کا منظر بن جائے اور جنتی کیفیات حاصل ہوجائیں، لاشعور میں موجود اس تصور کو نکالنا ہوگا اور اپنے آپ کو ذکر وفکر کے مجاہدوں کے لئے ہر صورت میں تیار کرنا ہوگا، اس سے انشاء اللہ جملہ تکالیف اور دکھ، غم اور اذیت کے احساسات از خود دور ہوجائیں گے۔

اگر فرد سے مراقبہ نہیں ہوتا تو اسے نفس پر جبر کرکے بھی اس سے مراقبہ کرانا ہوگا، فرد میں جتنے بھی نفسیاتی مسائل موجود ہیں، ان سب کا حل اسم ذات کے قلبی ذکر یعنی مراقبہ میں موجود ہے، زندگی بھر ڈاکٹروں کے چکر میں پڑنے کا بنیادی سبب ایک ہی ہے کہ لاشعور میں احساس تنہائی، احساس بیماری اور مرض میں غیر معمولی مبالغہ کے اثرات موجود ہیں، مراقبہ سے لاشعور کی اس حالت میں تبدیلی برپا ہوگی اور اس میں ازخود ٹھراؤ آنا شروع ہوجائے گا، اس طرح فرد ڈاکٹروں کے چکر میں پڑنے سے ازخود بچ جائے گا۔

مراقبہ کی حیثیت ان ساری وٹامنس کی سی ہے، جن وٹامنس کی جسم، دل وروح کو ضرورت درپیش ہے، اس لئے لاشعور میں موجود نفسی قوتیں اللہ کے ذکر کی طرف آنے کی راہ میں سو بہانے تراشتی اور تلاش کرتی رہتی ہیں، مثلا دماغ کی حالت صحیح نہیں، طبیعت صحیح نہیں، کام زیادہ ہے، حالات اجازت نہیں دیتے، اتنا وقت ہی نہیں، کاروباری ومعاشی

مصروفیات اجازت نہیں دیتی، یہ نفس کے تراشے ہوئے بہانے ہیں، جب فرد روزگار کے لئے دس دس گھنٹے نکال لیتا ہے تو آخر ذکر کے لئے دو گھنٹے کیوں نہیں نکل سکتے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ذکر کی اہمیت نہیں اور وہ زندگی کی ترجیحات میں شامل نہیں۔

ذکر ومراقبہ کے سلسلہ میں نفس کے ان بہانوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کئے بغیر چارہ کار ہی نہیں، ہمت سے جب ایک بار فرد مراقبہ کو ڈیڑھ دو گھنٹے تک پہنچائے گا تو اس سے اسے جو حلاوت حاصل ہوگی، وہ حلاوت اسے ازخود زیادہ سے زیادہ مراقبہ کے لئے وقت نکالنے پر مجبور کرے گی۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مراقبہ کے سلسلہ میں نفس سے مصالحت فرد کے لئے موت کے مثل ہے اور اس کے لئے قیامت خیز حالات لانے اور سو نئے مسائل پیدا کرنے کا موجب ہے، مثلاً اس پر یہ احساس غالب ہوگا کہ معلوم نہیں میرا اور میرے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا، کہیں میرا کاروبار تباہی سے دوچار نہ ہوجائے، کہیں کل مجھے روٹی کے لئے محتاج نہ ہونا پڑے، غرض کہ ذکرومراقبہ کے بغیر اس طرح کے بے شمار خطرات لاحق ہونے لگتے ہیں، یہ خطرات دل وروح کو اس کی بھرپور غذا نہ دینے اور اغوائے نفس ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور فرد شب وروز انہی حالات میں رہ کر ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات تنکہ بھی گرتا ہے تو وہ اپنے اوپر پہاڑ گرتے ہوئے محسوس کرتا ہے، ذکر ومراقبہ کے بغیر فرد بیشمار روحانی، نفسیاتی اور جسمانی بیماریوں کی نذر ہوجاتا ہے۔

مراقبہ، فرد کی حساسیت، نازک مزاجی، تھوڑی تھوڑی بات پر منفی نوعیت کی تاثیر پذیری والی حالت کو تبدیل کرکے، اس کے لئے حقیقت پسندی کا ذریعہ بنتا ہے، مراقبہ، آخرت کے تصور اور اس کے مناظر کو آنکھوں کے سامنے لاکر، مادی دنیا کے مسائل کے ہیچ ہونے کے احساس کو غالب کرتا ہے، مراقبہ، زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ساتھ اللہ کی مدد اور اس کی طرف سے خود اعتمادی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، مراقبہ، دل کو راست روی پر قائم رکھتا ہے، اور اسے احساس کمتری سے بچاتا ہے، مراقبہ، احساس تنہائی، احساس بے گانگی، احساس بے بسی جیسی ساری چیزوں کو ختم کرتا ہے، مراقبہ، فرد کو حوصلہ وہمت کے ساتھ زندگی کے مشکل سے مشکل تر حالات ومسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت عطا کرتا ہے، مراقبہ، فرد کی قساوت قلبی کو ختم کرکے، رحم، نرمی، شفقت اور افراد سے محبت پیدا کرنے کا موجب ہے، مراقبہ، مادیت اور کثرت دولت کی پرستش کے بت کو پاش پاش کرنے کا باعث ہے۔

ذکر ومراقبہ، کاروباری ومعاشی سرگرمیوں میں بھی باعث خیر وبرکت ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ اس سے ارتکاز قوت قائم رہتی ہے، جس سے معاشی وکاروباری سرگرمیوں میں یکسوئی متاثر نہیں ہوتی، مراقبہ، علم میں بھی اضافہ کا ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اللہ کے ذکر کے نور سے ذہن اور دل پر نئے نئے قیمتی نکات کا نزول ہوتا رہتا ہے۔

جو ذکر ومراقبہ اتنے زیادہ فوائد وثمرات کا حامل ہے، اس مراقبہ سے مختلف بہانوں سے اعراض ودوری کی روش اختیار کرنا، یہ جہاں سب سے زیادہ محرومی کی بات ہے، وہاں فرد وافراد کو بے رحم مادی قوتوں کے حوالے کرکے، اس پر جہنم سے پہلے جہنم کے منظر کو طاری کرنا ہے۔

آنکھیں کھولنے، بہانوں وتاویلات سے بلند ہونے اور ہمت وحوصلہ کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ آج کل افراد جس بحران، جس فساد اور جتنے بھی مسائل وپریشانیوں کا شکار ہیں، ان سب کا سبب اللہ کے ذکر ومراقبہ سے دوری ہی ہے۔

جس ذکر ومراقبہ کے یہ سارے فوائد بیان کیے گئے، اس مراقبہ کے لئے دل کی آمادگی اور اس میں استحکام کے لئے صاحبان دل سے دل کے رشتہ کو قائم رکھنا اور ان سے صحبت ورابطہ کے تعلق کو برقرار رکھنا ضروری ہے، اس کے بغیر ذکر ومراقبہ میں استقامت سے چلنا ممکن نہیں۔

اہل اللہ کے اپنے تجربات جو تحریری صورت میں موجود ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس دن ان کا ذکر وفکر کا ناغہ ہوتا ہے، وہ دن ان کے لئے ذہنی دباؤ، اشتعال وجھنجھلاہٹ کا دن ہوتا ہے، اس لئے کہ اس دن، دل وروح کو اس کی مطلوبہ غذا نہ ملنے کی وجہ سے وہ حالت اشتعال میں ہوتے ہیں، ان کے اشتعال کی سزا پورے جسمانی نظام کو بھگتنی پڑتی ہے، حضرت نظام الدین اولیاء کی ملفوظات کی کتاب میں ہے کہ طالب سے جس دن معمول کا

ذکر وفکر نہ ہوگا، اس دن اس پر تین حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت ضرور غالب ہوگی، یا تو اس پر اشتعال اورغصہ کی حالت غالب ہوگی، یا وہ شہوت سے مغلوب ہوگا، یا پھر وہ کسی حادثہ سے دوچار ہوگا، اور کسی بلا وآفت کا شکار ہوگا۔

جب متوسط صوفی کو ایک دن کے ذکر کے ناغہ کی یہ سزا ملتی ہے تو عام طالب کو ذکر نہ کرنے یا اس میں غفلت کے مظاہرے یا برائے نام ذکر کرنے سے جو سزا مل سکتی ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، بالخصوص متوسط صوفی کے لئے تو ایک دن کے ذکر کا ناغہ اس کے لئے قیامت خیز ثابت ہوتا ہے، اس دن وہ دنیا کی ہیبت کے ایسے احساس سے سرشار ہوگا کہ گویا دنیا میں اس کے لئے زندگی کے سارے دروازے بند ہوگئے ہیں۔

ذکر ومراقبہ کو معمولی سمجھنا حماقت درحماقت ہے، حقیقت یہ ہے کہ فرد کی ساری زندگی ذکر ہی سے وابستہ ہے، اس لئے حدیث شریف میں ذکر کرنے والے کو زندہ اور ذکر نہ کرنے والے کو مردہ قرار دیا گیا ہے، ڈیڑھ سے دو گھنٹے تک کا مراقبہ فرد کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر اس کے دل وروح کی تسکین وتشفی نہیں ہوسکتی، بالخصوص ذہنی دباؤ میں آنے والے افراد کے لئے روزانہ کم از کم اتنا مراقبہ ان کی نفسیاتی، ذہنی اور وجدانی صحت کے لئے بھی ضروری ہے، اس کے بغیر ایسے افراد باطنی طور پر زیر وزبر ہوں گے اور ایسے ذہنی خلفشار سے دوچار ہوں گے کہ انہیں ڈپریشن کی دواؤں کی بڑی سے بڑی خوراک بھی قابو میں نہ رکھ سکے گی، ایسے افراد کے لئے اپنے کاروباری وگھریلو معاملات کو سلیقہ سے سرانجام دینا ممکن نہیں، وہ موت سے پہلے موت کے سے حالات سے دوچار ہوں گے، جھنجھلاہٹ، اشتعال، دنیا سے نیازی، مایوسی، احساس بے گانگی، دنیا کی ہیبت، اللہ کی نعمتوں کی عدم شکر ادائیگی، لوگوں سے الجھاؤ اورخوف زدگی، دل کی ڈھڑکوں کی تیزی اور بے بسی جیسی بیماریاں انہیں گھیر لیں گی۔

ذکر ومراقبہ، اس دنیا میں اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ دین ودنیا کی ساری نعمتیں اسی سے وابستہ ہیں، ذکر ومراقبہ، فرد کے تزکیہ میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے، شرط یہ ہے کہ جس روحانی استاد سے مراقبہ لیا جائے، وہ صاحب شریعت وصاحب تقویٰ ہو، جاہل فقیر یا شریعت سے بے نیاز عامل نما بزرگ یا مادی نوعیت کا مراقبہ تزکیہ میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتا، اگرچہ اس سے ذہنی دباؤ میں کسی حد تک کمی واقع ہوتی ہو، لیکن اس طرح کے مراقبہ سے حب جاہ وحب مال کے جذبات مدھم ہوں، فرد میں سلیقۂ انسانیت پیدا ہو اور جملہ انسانی واخلاقی اوصاف پیدا ہوں، اور اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا آسان ہو، ممکن نہیں، مراقبہ، نماز میں بھی خشوع وخضوع پیدا کرنے اور محبوب حقیقی سے راز ونیاز کی باتیں کرنے کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ ذکر ومراقبہ کے انوار کے نتیجہ میں دل، روح اور دماغ پر ان انوار کے اثرات غالب رہتے ہیں، اور نفس کی گرفت ڈھیلی پڑنے کی وجہ سے اسے دماغ کو وسوسوں میں مبتلا کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

مختصراً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسانیت کی جتنی بھی خصوصیات واوصاف موجود ہیں، ذکر و مراقبہ میں انہاک فرد میں یہ سارے اوصاف پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

ذکر ومراقبہ، ہر طرح کے خوف وحزن بے یقینی وتذبذب سے بچاؤ کا مؤثر ترین ذریعہ ہے، مراقبہ کے ذریعہ محبوب حقیقی سے جو رشتہ قائم ومستحکم ہوتا ہے، وہ طالب کو اس حدیث کے مصداق بناتا ہے کہ جو اللہ کا ہوجاتا ہے، اللہ اس کا ہوجاتا ہے، مراقبہ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والے نقصان، مزاج کے خلاف ہونے والی باتوں کو برداشت کرنے اور تحمل سے ہر طرح کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت میں اضافہ کا بھی ذریعہ بنتا ہے، یہ نکتہ سمجھنا ازخود ضروری ہے کہ نفس کے خلاف مزاحمت کرکے، اسے مہذب بنانا، یہ ایسا کام ہے جس سے دین ودنیا کی ساری بھلائیاں وابستہ ہیں، اس کے بغیر نہ تو سلیقۂ انسانیت آتا ہے، اور نہ ہی اوصاف حمیدہ پیدا ہوسکتے ہیں اور دین پر چلنے کی سعادت کا حاصل ہونا بھی دشوار ہے، اس لئے خود احتسابی کے ذریعہ نفس کے سرکش گھوڑے کو راہ محبت میں چلائے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں، بالخصوص اب جو دور آیا ہے، اس میں تو مراقبہ کو ڈیڑھ دو گھنٹے تک پہنچائے بغیر فرد کی ذہنی حالت صحیح ہو اور وہ ذہنی امراض ودباؤ سے بچ سکے، ممکن ہی نہیں۔

فرد کو اپنے اوپر رحم کھاتے ہوئے نفس سے ایک بار جنگ کے لئے ہر صورت میں تیار ہونا ہوگا اور اس سے چوبیس گھنٹوں میں ڈیڑھ دو گھنٹوں کا ذکر ومراقبہ ہضم کرانا ہوگا، نفس یقیناً شروع میں مزاحمت کرے گا، لیکن چند ہفتوں اور مہینوں تک ایسا کرنے سے ذکر ومراقبہ سے طبعی مناسبت پیدا ہونا شروع ہوجائے گی، اس کے بعد مراقبہ میں ایسی حلاوت محسوس ہوگی کہ فرد یہ محسوس کرے گا کہ اس دنیا میں اب گویا اس کا کوئی مسئلہ ایسا نہ رہا ہے، جس پر وہ مضطرب ہو، اس لئے کہ اس مقام پر دل وروح کی سکینت وخوشی اس حالت پر آئے گی، جہاں نفس کے لئے دل ودماغ کو مضطرب وبے قرار کرنے کے مواقع مسدود سے مسدود تر ہوجائیں گے، اس وقت فرد اس احساس کا حامل ہوگا کہ نفس سے مزاحمت کے لئے اس نے جو قربانی دی ہے، اس قربانی کی بدولت اسے جو سکینت اور محبوب سے محبت ومعیت کی جو دولت عظمیٰ حاصل ہوئی ہے، وہ اس قربانی کے بدلہ میں بہت بڑی دولت ہے، نیز یہ بہت معمولی قربانی ہے، جس سے اسے اتنی بڑی دولت حاصل ہوئی ہے، اصل چیز ہمت وحوصلہ واستقامت ہے جو صاحبان دل کی صحبت اور ان سے مستقل رابطہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

صاحبان دل سے صحبت بے دلی سے نہیں، بلکہ خوش دلی سے، ساتھ ساتھ وہ جو اصولی اور بنیادی تعلیم دیں، فرد ان پر عمل پیرا بھی ہو، ان کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ ذکر ومراقبہ کو وظیفہ حیات بنائیں، اس سے وہ رفتہ رفتہ دیکھیں گے کہ ان کی ساری الجھنیں اور سارے مسائل آسان سے آسان تر ہوتے جائیں گے، زندگی پاکیزگی کا نمونہ بن جائے گی، اور احساسات میں حسن پیدا ہوتا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تو ایسی دولت عظمیٰ ہے کہ دنیا کی ساری دولت خرچ کرکے بھی حاصل نہیں ہوسکتی، چنانچہ صاحب دل شخصیت حریص ہوتی ہے کہ کاش کہ فرد وافراد اپنی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے راہ محبت اختیار کرلیں اور اللہ کے ذکر کے نور سے دل وروح کی تشفی کا سامان کریں، تاکہ دین پر چلنا آسان ہوجائے اور سعادت دارین کی راہ نصیب ہو۔

جو طالب راہ سلوک میں داخل ہونے کے بعد برسوں تک ذکر ومراقبہ کے لئے قابل ذکر وقت نکالنے کے لئے تیار نہ ہو اور وہ اپنے لئے یہ طے کر چکا ہو کہ اس کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدے دشوار تر ہیں، وہ راہ سلوک میں تبرک کے طور پر ہی چلتا رہے گا یا ذکر وفکر برائے نام کرنے پر اکتفا کرے گا تو ایسا طالب دراصل بے حوصلگی کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ اس بے حوصلگی کے ذریعے دل ودماغ، اعصاب وجوارح کو یہ پیام دے چکا ہوتا ہے کہ وہ اس راہ میں نہ تو اس کی ہمنوائی اختیار کریں، نہ ہی کوئی کردار ادا کریں، چنانچہ اعصاب وجوارح کو یہ پیام ملنے کے بعد وہ اس سلسلہ میں بے حس اور سرد ہوجاتے ہیں، اور اس طرح کے طالب کے لئے ایک گھنٹہ کا ذکر ومراقبہ ایسا دشوار گذار ہوتا ہے، گویا اس کے لئے ہمالیہ پہاڑ طے کرنا ہو، اس طرز عمل سے اس طالب کو زندگی کے دوراہے پر بعض بڑے بڑے بحرانوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ دل کی مہلک بیماری تک میں مبتلا ہونے لگتا ہے، اس لئے کہ اس کے لئے حالات ومسائل اور مشکلات کا دباؤ برداشت کرنا ممکن نہیں، جو دل محبوب حقیقی کے انوار سے پوری طرح فیضیاب نہیں ہوتا، وہ دل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوکر مریض بن جاتا ہے، اور زبان حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ مجھے میری محبوب ترین خوراک مطلوبہ مقدار میں نہ ملی، اس لئے میں زیروزبر ہوں اور اس مادہ انسان کے ساتھ اب زیادہ دیر ساتھ رہنا دشوار ہے، فرد کو ملنے والی یہ سزا صرف اور صرف ہمت وحوصلہ کے فقدان کا نتیجہ ہوتی ہے، اگر فرد ہمت وحوصلہ سے کام لے کر ذکر ومراقبہ کے دورانیہ میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتا رہتا تو باآسانی ڈیڑھ دو گھنٹے تک اس کے مراقبہ کا معمول ہوسکتا تھا، اس طرح اس کے لئے یہ زندگی جنت کے منظر سے پہلے جنت کا منظر بن سکتی تھی، لیکن سستی، غفلت اور نفسی تاویلات نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔

یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ تصوف میں شیخ اور صاحب دل شخصیت کی بنیادی باتوں پر عمل کرنا انتہائی ضروری ہے دوسری صورت میں طالب پر آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا

ہے، ایسی آزمائشیں جس سے نکلنے کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں، کوئی بھی شیخ اپنے ساتھ وابستہ طالب پر اس کی استعداد اور ذہنی وعملی صلاحیتوں وتوانائیوں سے زیادہ کا بوجھ نہیں ڈالتا، دوچار سال تک چلنے والے طالب سے اس کا مطالبہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ روزانہ کے مراقبہ کے عمل کو ہر صورت میں ڈیڑھ گھنٹے تک پہنچائے، چاہے مراقبہ کا یہ عمل دن میں تین چار بار ہو، اس سے انشاء اللہ وہ ہر طرح کے بحرانوں سے نکل آئے گا۔

اس عاجز نے آپ کی خدمت میں یہ جو معروضات پیش کی ہیں، یہ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کے وسیع وگہرے تجزیہ کے نتیجہ میں کی ہیں، ہر انسان کو درپیش مسائل اسی ایک مسئلہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں کہ فرد دل وروح کو اس کی مطلوبہ خوراک دینے کے لئے تیار نہیں، جس کے نتیجہ میں دل وروح مشتعل ہوکر فرد کو نفسیاتی، ذہنی واعصابی مسائل سے دوچار کرتے ہیں، اور اس کے احساس کو خراب سے خراب تر کردیتے ہیں، احساس کی خرابی ہی سے منفی سوچ ظاہر ہوتی ہے۔ مراقبہ سے دوری فرد کو خوداعتمادی کے بحران سے دوچار کردیتی ہے، اور خوداعتمادی کا بحران فرد کو اندر سے کھوکھلا کردیتا ہے اور کسی بھی معاملہ میں اس کی قوت فیصلہ کی صلاحیت کو متاثر کرتا ہے اور اسے زندگی کے ہر معاملہ میں تاریک پہلو ہی نظر آنے لگتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ فرد کے اندر غصہ، اشتعال، انانیت، خودسری، خودرائی اور ذکر سے غفلت کے جذبات بہت طاقتور صورت میں موجود ہوتے ہیں، جو زندگی بھر فرد کی داخلی زندگی میں طوفان برپا کرتے رہتے ہیں اور عقل کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں، ان جذبات ومیلانات کو حد اعتدال میں لائے بغیر نہ تو تزکیہ ہوتا ہے، اور اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں، اور نہ ہی فرد سکون وسکینت سے بہرہ ور ہوتا ہے، پھر ان جذبات ومیلانات کی وجہ سے فرد اپنے اہل وعیال اور احباب کے لیے بھی اذیت وتکلیف کا موجب بنتا ہے، یہ میلانات وجذبات ایسے ہیں جو فرد کی بہت ساری خوبیوں پر پانی پھیرنے کا موجب بن جاتے ہیں، اس لئے اس میلانات کو حد اعتدال میں لانے کا کام ایسا ہے، جو ترجیحات میں اولیت کا حامل ہے اور ان جذبات کی تہذیب کا عمل ذکر وفکر کے مجاہدوں اور صحبت اہل اللہ کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک اور چیز جس کی ضرورت ہے وہ مرغن غذاؤں، چٹ پٹی چیزوں، بازاری غذاؤں، گوشت کا کثرت سے استعمال اور لذیذ چیزوں پر ٹوٹ پڑنے کی عادت سے احتیاط کرنا ہے، اس لئے کہ اس طرح کی چیزوں کے زیادہ استعمال سے ایک تو روح کمزور ہوتی ہے اس کی پرواز متاثر ہوتی ہے۔

دوم یہ کہ اس سے جسمانی عوارض پیدا ہوتے ہیں، مختلف بیماریاں جسم کا حصہ بننے لگتی ہے، سوم یہ کہ اس سے نفس کے طاقتور ہونے میں مدد ملتی ہے اور جنسی اشتعال غالب ہونے لگتا ہے۔

نفس کا روح پر غلبہ پانے اور جسم کو بیماریوں کا شکار بنا کر راہ سلوک میں چلنے میں رکاوٹ پیدا کرنے میں ان غذاؤں کو کافی عمل دخل حاصل ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ گوشت وغیرہ کا استعمال چھوڑ دیا جائے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اس طرح کی چیزوں کو عادت نہ بنالیں کہ فرد اس کے بغیر رہ نہ سکے۔

دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کی لذیذ اور مرغن غذاؤں کے مسلسل استعمال نے فرد کے جسم کو مریض خانہ میں تبدیل کردیتا ہے۔

سادہ غذا، ایسی غذا جسے معدہ ہضم کر سکے اور جس سے جگر صحیح طور پر کام کر سکے۔ اس کے استعمال کی عادت بنائی جائے، اس سے نفس کی طرف سے روح کے راستہ میں حائل رکاوٹیں بھی کسی حد تک دور ہوں گی۔

صوفیاء کے ہاں صدیوں سے راہ سلوک کے طالبوں کے لئے کم کھانے، کم ملنے، کم بولنے اور کم سونے کے جو اصول کارفرما تھے، ان میں بڑے حکمت پوشیدہ تھی، اس کے غیر معمولی ثمرات وبرکات تھی۔

اب بھی ان اصولوں پر عمل کرنے سے طالب کی روحانی ترقی میں اضافہ ہوگا، اور اس کی صحت بھی بہتر سے بہتر ہوگی۔ البتہ ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدہ کرنے والے طالبوں کے لئے بزرگ خمیرہ جات یا مغزیات کا استعمال ضروری قرار دیتے رہے ہیں، اس سے نفس کی طرف سے روح کے راستہ میں حائل رکاوٹیں بھی کسی حد تک دور ہوں گی۔

اہل علم واہل دانش ساتھی کے نام

علم اللہ کا بڑا انعام بھی ہے تو آزمائش بھی، انعام ان کے لئے ہے، جو فطرت سلیمہ کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے نفس مطمئنہ کے سفر پر گامزن رہتے ہیں۔ آزمائش ان کے لئے ہے، جو فطرت سلیمہ اور نفس لوامہ کے تقاضوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے انانیت اور خود رائی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ زیر نظر مضمون دراصل اپنی اس وقت کی حالت کو پیش نظر رکھکر لکھا گیا ہے، جب صاحبان دل وصاحبان معرفت سے دوری کی روش غالب تھی اور اس کی وجہ سے علمِ محض اور عقل کی بھول بھلیوں نے خوبصورت تاویلوں سے حقیقت سے دور بلکہ بہت دور کر دیا تھا، اپنی اس وقت کی حالت کو یاد کرتا ہوں تو اپنی حالت زار پر بہت زیادہ رحم محسوس ہوتا ہے، تاہم اللہ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے اپنے دوستوں کی صحبت نصیب فرما کر، نفسی قوتوں سے آشنائی کی راہ پر ڈال دیا۔ میرے متعدد صاحب علم ودانش ساتھی ابھی تک اسی راہ پر گامزن ہیں۔ ان سے محبت اور ہمدردی کے پیش نظر یہ سطور رقم ہوئی ہیں۔ صاحب علم ودانش شخص عام طور پر زندگی کے دوراہے پر جس صورتحال سے دوچار ہوتا ہے، وہ درج ذیل صورتحال ہوتی ہے۔

(۱) وہ قیل وقال میں آگے ہوتا ہے، عمل میں فروتر

(۲) وہ اپنے علم، اپنی تحقیق اور اپنی رائے کو حرف آخر سمجھتا ہے۔اس میں ازسرنو غور وفکر کی ضرورت ہرگز محسوس نہیں کرتا۔

(۳) بڑے بڑے اکابر صاحبان علم کے علم کو وہ اپنے علم کے مقابل سمجھتا ہے۔ اس طرح وہ امت کی مسلمہ علمی شخصیتوں کے علوم وفیوض سے بے بہرہ رہتا ہے۔

(۴) وہ زندگی بھر الفاظ کے خولوں سے بھری ہوئی وادی علم میں بھٹکتا پھرتا ہے اور نورمعرفت سے بہرہ وری کی راہ پر آنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوتا۔

(۵) کثرت علم وکثرت مطالعہ کی وجہ سے وہ اپنے حلقہ میں اپنی فوقیت ظاہر کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، اس طرح وہ اپنے حلقہ احباب کی دلوں میں مقام حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے۔

(۶) قلبی سکون کی دولت سے عدم بہرہ وری کی وجہ سے وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوتا ہے۔ اور علم اسے اس دباؤ سے بچانے میں معاون ثابت نہیں ہوتا، اس ذہنی دباؤ کی وجہ سے اشتعال، جھنجھلاہٹ، نفرت، کدورت وغیرہ اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں۔

(۷) وہ انانیت کے مرض کا شکار ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی شخصیت دیگر کئی امراض کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

(۸) اسلامی شریعت کے فرائض وواجبات کی ادائیگی میں وہ سست واقع ہوتا ہے، اگر عادت کی وجہ سے فرائض وواجبات اس سے ادا ہوتے بھی ہیں تو وہ اس کے حقیقی ثمرات سے متمتع نہیں ہوتا۔

(۹) وہ جدیدیت کی فکری لہروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس لئے کہ جدیدیت، آزاد خیالی کو مہمیز دیتی ہے اور آزاد خیالی اس کا وتیرہ بن جاتی ہے، اس آزاد خیالی کی وجہ سے سلف وخلف سب اس کی تنقید کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ یہی آزاد خیالی اس کی شخصیت کے داخلی بحران میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہے۔

(۱۰) اگر صاحب علم شخص زیادہ علمی، تحریری وتقریری صلاحیتوں کا حامل ہے تو وہ اپنی ان صلاحیتوں کی وجہ سے ملت میں تفریق پیدا کرنے اور امت میں نئے گروہ کو جنم دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔

(۱۱) حب مال کی لہریں اسے زیر وزبر کرتی رہتی ہیں اور مال کی فکر اسے غیروں کا سہارا لینے پر مجبور کردیتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی ڈور غیروں کے حوالے ہوجاتی ہے۔

(۱۲) وہ دین کے صحیح نصب العینی کام اور دین کے فرائض وواجبات کی صحیح ترتیب جو سلف سے خلف تک تسلسل کے ساتھ آرہی ہے، اس کے فہم سے قاصر ہوتا ہے۔ اپنے علم، عقل اور خودرائی کی وجہ سے دین کی جس تشریح کو وہ صحیح سمجھتا ہے، وہ تشریح اسے سبیل المومنین سے گرا کر، گمراہی میں مبتلا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

(۱۳) وہ حقیقی محبت کی حلاوت سے محرومی کی وجہ سے نئے نئے افکار اور نئی نئی چیزوں کی محبت کا شکار رہتا ہے۔

(۱۴) حقیقی محبت سے محرومی کی وجہ سے اس کے لئے کردار میں پاکیزگی، مزاج میں ٹھہراؤ واعتدال اور باطنی نور سے فیضیابی کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں۔

(۱۵) وہ معاشرہ میں جوڑ سے زیادہ توڑ پیدا کرتا رہتا ہے۔

(۱۶) وہ علم وعقل واستدلال میں جتنا آگے بڑھتا ہے، اسی مناسبت سے وہ حق وحقیقت سے دور تر ہوتا جاتا ہے، لیکن وہ حجابات کی وجہ سے اس کے ادراک سے قاصر ہوتا ہے۔

(۱۷) علم وعقلیت میں تیزی کا ایک لازمی نتیجہ خودرائی اور آزادی ہے، (جس کا اوپر ذکر ہوا) یہ آزاد خیالی ایک تو خارجیت اور داعش جیسے رویوں کو جنم دینے کا ذریعہ بنتی ہے، دوم یہ کہ اسی آزاد خیالی سے سیکولرزم اور اسلام کے نئے ایڈیشن کی تیاری کے میلانات ورجحانات پیدا ہوتے ہیں۔

علم وعقلیت اور اسلام کی خودرائی پر مبنی تشریح کے نام پر اس وقت ہمارے ہاں یہ دونوں طرح کے رجحانات ومیلانات شدت سے پیدا ہوچکے ہیں، جس نے معاشرہ کو شدید مفاسد سے دوچار کردیا ہے۔

(۱۸) اسلامی تحقیق اور خود ساختہ اسلامی تشریح کے شوق میں ایک بیماری جو پیدا ہوئی ہے، وہ قساوت قلبی کی بیماری ہے، اس لئے کہ جب امت کی مسلمہ شخصیتوں کی تردید وتکذیب ہوگی، ان کے دینی فہم پر اعتماد ختم ہوگا، ذکر سے طبعی مناسبت کا تعلق نہ ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ قساوت قلبی ہی کی صورت میں ظاہر ہوگا اور قساوت قلبی کی بیماری ایسی ہے، جو عبرت، موعظت، رجوع اللہ اور خوداحتسابی جیسی چیزوں کو سلب کردیتی ہے۔

(۱۹) علم وعقلیت کا دین کے ایسے مسائل میں استعمال، جس کے لئے غیر معمولی اجتہادی صلاحیت، تبحر علمی، رسوخ فی الدین، تقویٰ وبصیرت اور صلحائے امت کی طویل عرصہ کی صحبت جیسے اوصاف درکار ہیں۔

ان صلاحیتوں واوصاف کے بغیر مجتہد کے مقام پر فائز ہوکر، دینی تحقیقات کا کام ہاتھ میں لینا، دراصل اپنی ہلاکت کا سامان تیار کرنے کے مترادف ہے، جدیدیت سے تاثیری پذیری کے المیوں میں ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ صاحب دانش شخصیت کو اغویٰ کرکے، اسے محض کتابی علم کی بنیاد پر تشریح دین کے بلند مقام پر فائز کردیتی ہے۔

خودسری وخودرائی کے حامل علم وعقل کی کتنی بڑی سزا ہے، جو قدرت کی طرف سے اس طرح کی شخصیت کو ملتی ہے۔

اے صاحب علم ودانش، خوداحتسابی سے کام لے، کچھ وقت کے لئے اپنے علم سے دستبردار ہوکر خود کو صاحبان معرفت کے حوالے کر، تاکہ وہ تیرے خالی دل کو نور معرفت سے بھر سکیں اور اس میں موجود انانیت جیسے بتوں کو نکال سکیں اور تیرا تزکیہ کرکے، تجھے معرفت کے ایسے چشمہ سے سیراب کریں، جس سے علم کا حقیقی نور اور اس کا خزانہ پھوٹتا رہے۔

اے اہل دانش، اہل اللہ کے خادم کی یہ بات مان کر اپنے آپ کو دین ودنیا اور دنیا وآخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرلے۔

ہمارا اخلاقی انحراف

مغربی اخلاقی بحران کے پس منظر میں

ہمارے معاشرہ کا سب سے بڑا المیہ، جس سے معاشرہ ہمہ گیر وہمہ جہتی فساد سے دوچار ہے، وہ دراصل سیرت وکردار کی پاکیزگی کا المیہ ہے، جس کی وجہ سے معاشرہ میں ہونے والے بیشتر کام فساد سے دوچار ہیں۔

مغربی نظام تعلیم سے وابستہ افراد، سیرت وکردار کے بحران میں تو مبتلا ہیں ہی، جس کا نتیجہ ہم ملک کے ہر ادارے کی تباہی، غربت کے مناظر عام ہونے اور اہل سیاست، سرکاری عمال اور سارے مؤثر طبقات کی سنگ دلی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں، لیکن سیرت وکردار کے اعتبار سے دینداروں اور مذہب سے وابستہ شخصیتوں کی حالت بھی عام طور پر بہتر نہیں۔ گروہی تعصّبات، شدت پسندی، ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی روش، دوسرے گروہوں کے ہاں موجود خیر کے اجزاء کے فہم سے انکار کی روش، اس کے نتیجہ میں منافرت وکدورت کی فضا، مال وجاہ کی خاطر اپنے اپنے گروہوں کو مستحکم کرنے کی کوششیں، ظاہری بہتر دینداری، لیکن باطنی حجابات کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں بڑھتا ہوا خلفشار وغیرہ، مذہبی طبقات میں عام طور پر ان ساری چیزوں کا مشاہدہ ہورہا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اہل مذہب، ریاست ومعاشرہ پر اثر انداز ہونے میں ناکامی سے ہمکنار ہے۔

یہ ایسی صورتحال ہے، جس پر گہرائی سے غور وفکر کی ضرورت ہے کہ آخر ہم آئے دن سیرت وکردار کی پاکیزگی سے دور کیوں ہوتے جارہے ہیں، نیز سیرت وکردار کی پاکیزگی کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟

ہماری نظر میں سیرت وکردار میں پاکیزگی کا تعلق تزکیہ سے ہے، فطرت سلیمہ کو بیدار کرنے سے ہے، روحانی بالیدگی سے ہے، اور سیرت پاک کو اسوہ حسنہ بنانے سے ہے اور نفسی قوتوں کو اللہ ورسول کے مکمل تابع بنانے سے ہے اور باطن کی اصلاح سے ہے، اور عبدیت کی صلاحیتوں کی بیداری سے ہے، یہ ساری چیزیں اللہ سے مستحکم تعلق پیدا کرنے، بلکہ اللہ سے والہانہ محبت کا تعلق قائم سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ جو فرد اپنی خالق ہستی (جو اس کی سب سے بڑی محسن ہستی ہے) اس سے اپنے تعلق کو صحیح طور پر استوار نہیں کرسکتا، اس ہستی سے اپنے معاملات درست نہیں کرسکتا، اس کا وفادار نہیں بن سکتا، وہ بندوں کے ساتھ اپنے معاملات بہتر طور پر سرانجام دے سکے، ان سے محبت، عاجزی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرسکے، انہیں اپنی دلوں میں جگہ دے سکے، ممکن نہیں، یہ ایسی بات ہے جو ہر فرد آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اور اس کے فہم کے لئے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک قومی اخلاق، کاروباری اخلاق اور روایتی اخلاق کا تعلق ہے تو وہ مروجہ تعلیمی اداروں اور ذہنی تربیت کے ذریعہ کسی حد تک پیدا ہوسکتا ہے، لیکن حقیقی اخلاقی زندگی جس سے انسانیت، خیر وبرکت سے بہرہ ور ہو، جس سے نفرتیں وکدورتیں دور ہوں، افراد ایک دوسرے کے لئے ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرکے، ایک دوسرے کی مشکلات کے وقت کام آسکیں، جہاں مصیبت زدہ افراد کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا جائے، ان سارے کاموں میں بے غرضی، بے نفسی اور للھیت شامل ہو، اس طرح کا کردار ہی وہ حقیقی کردار ہے، جس سے افراد معاشرہ فوز وفلاح سے ہمکنار ہوتے ہیں اور جہاں اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، ہمارا معاشرہ اس طرح کے پاکیزہ کردار سے کوسوں دور ہے، جب کہ یہ اٹل حقیقت ہے کہ قوموں کا سارا عروج وزوال پاکیزہ اخلاق وکردار سے بہرہ وری اور اس سے محرومی سے ہی وابستہ ہے، جو قومیں اخلاقی اعتبار سے بلندی کے مقام پر فائز ہوتی ہیں، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اور انسانوں کی سطح پر قوموں کے ساتھ اپنے معاملات کو تصادم وٹکراؤ کے بغیر انسانیت کے شایانِ وشان حل کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

جب قوموں کے لئے اخلاق وکردار کی پاکیزگی اتنی فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے تو سوال یہ ہے کہ معاشرہ میں پاکیزہ اخلاق کی تعمیر وتشکیل کا کام کیسے ہو؟ اس کا ایک طریقہ تو وہی ہے، جو اہل مغرب نے اختیار کیا ہے کہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ اخلاقی نشوونما کا انتظام ہو، جس سے افراد ایک حد تک معاشرے اور ریاست کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں اور ریاست کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں، نیز لوگوں کے مسائل کے حل کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لائق ہوتے ہیں، لیکن چونکہ مغرب کے اخلاقی تربیت کے اس نظام میں مذہب، روحانیت اور فطرت سلیمہ کے

اجزاء کی مکمل طور پر نفی شامل ہے، اس لئے مغرب کا یہ قومی اخلاق ان کی روحانی صلاحیتوں کی بالیدگی میں ناکام ثابت ہوا ہے اور ان کے ہاں انسان کی کل حیثیت ترقی یافتہ حیوان سے زیادہ نہیں رہی۔ اور حیوانوں اور درندوں کی تربیت کا جتنا بھی اہتمام ہو، ظاہر ہے حیوانیت ودرندگی کے اثرات سے بچاؤ کی صورت پیدا نہ ہوسکے گی، اہل مغرب کی عملی زندگی میں اس کا مظاہرہ عام ہے۔

ان کا سرمایہ دار سنگ دلی میں پچھلے دور کے سارے سرمایہ داروں کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ان کے ہاں طب کا پیشہ سب سے مہنگا تر پیشہ ہے۔ عام فرد کے لئے اپنی ذاتی آمدنی سے علاج کرانا دشوار تر ہے، مہنگائی اتنی زیادہ ہے کہ بنیادی ضروریات کے لئے گھر کا ہر فرد، عورت اور مرد جانوروں کی طرح کام میں جتے رہنے پر مجبور ہیں۔ سرمایہ دار کی خونخواری کی حالت یہ ہے کہ غریب قومیں اناج کے لئے ترس رہی ہوتی ہیں، بھوک سے بلبلا رہی ہوتی ہیں، یہ اناج کے دام کو گرنے نہ دینے کی خاطر سمندر میں ضایع کرنے کے لئے تو تیار ہوتے ہیں، لیکن بھوکیں قوموں کو سستی قیمت پر اناج دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، مغربی سرمایہ دار نے اسلحہ کی پیداوار اور اس کی کھپت کی خاطر قوموں میں جنگوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کردیا ہے۔

مغربی انسان اس اعتبار سے بھی قابل رحم ہے کہ ان کے ہاں خونی رشتہ کا تقدس لگ بھگ ختم ہو چکا ہے۔ بیوی کی شوہر سے اور شوہر کی بیوی سے وفاداری ومحبت کا نظام ختم ہے۔ عورت ومرد جنسی تعلقات کے سلسلہ میں آزادی کی راہ پر گامزن ہیں۔ انسانوں سے بیزاری اور کتوں سے وفاداری کی امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں، جسمانی طہارت کا تصور ناپید ہے، برسوں گزر جاتے ہیں، مرد وعورت نہانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، ایک دوسرے کے لئے ایثار وقربانی کے مظاہر کی امید ختم ہو چکی ہے، زنا، شراب، سود اور خنزیر کے گوشت کا استعمال تو ان کے کلچر کا حصہ ہے۔ ڈپریشن کا مرض عام ہے، خودکشی کا میلان زیادہ ہے۔

مغربی حکمران جو لوگوں کے ووٹوں سے برسراقتدار آتے ہیں، وہ عالمی سطح پر مکر وفریب کی سیاست، سودی قرضوں اور دھونس ودباؤ کے ذریعہ کمزور ریاستوں پر اپنی پالیسیاں مسلط کرکے، ان کی آزادی کو سلب کرنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ اور یہ ریاستیں پچھلے دھائی تین سو سال سے یہ کردار ادا کررہی ہیں، پھر میڈیا کے ذریعہ پروپیگنڈہ یہ ہے کہ مغرب ہی انسانیت نوازی، حریت فکر وآزادی اور مساوات کا علمبردار ہے۔ اب تو مغربی قوموں نے مسلم ملت کو ان کی تہذیب واقدار سے بے بہرہ کرنے کے لئے دولت کے دہانے کھول دیئے ہیں اور بڑے پیمانہ پر ضمیر کی خریدوفروخت کا کام شروع کردیا ہے، مسلم ریاستوں کے ہر ذہین فرد کو خرید کر، انہیں میڈیا، صحافت اور دوسرے ذرائع سے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوششیں تیز تر ہے، مغربی حکومتوں کے ان سارے کاموں میں مغربی انسان اس کے ہمنوا ہے اور ان کا مکمل ساتھی ہے۔

ان ساری کاروائیوں کے باوجود اپنے آپ کو مہذب کہلوانے کا دعویٰ فریب کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے۔

ہمارے ہاں مغربی نظام تعلیم عام ہے اور لگ بھگ وہی نتائج پیدا کر رہا ہے، جو وہ مغرب میں پیدا کر چکا ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے اس سے بدتر نتائج پیدا کررہا ہے، بدقسمتی سے ہمارے ہاں قائم مغربی نظام تعلیم میں قومی اخلاق اور کاروباری اخلاق پیدا کرنے کا تربیتی نظام بھی موجود نہیں ہے۔

اخلاقی نصب العین اور اخلاقیات پیدا کرنے کی ایک صورت ہمارے ہاں دینی مدارس میں موجود ہے کہ قال اللہ وقال الرسول کے ذریعہ افراد میں اخلاقی روح منتقل کی جائے اور ان کی سیرت وکردار میں جلا پیدا کی جائے، لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اس نظام تعلیم سے دینی تعلیم تو حاصل ہوجاتی ہے۔ دینداری کی ظاہری صورت بھی پیدا ہوجاتی ہے، کسی حد تک اخلاق بھی آجاتے ہیں، لیکن عام طور پر اس سے سیرت وکردار میں رونق پیدا نہیں ہو پاتی اور حب جاہ وحب مال کے امراض دور نہیں ہوتے۔

اہل مغرب کے کردار کا جو پہلو سب سے زیادہ المناک ہے، جس نے دنیا میں کشیدگی پیدا کی ہے، وہ حریت فکر اور آزادی کے اپنے ملحدانہ تصورات کو مختلف حربوں سے دنیا پر مسلط کرنے اور اسلامی تہذیب کو اپنی مادہ پرست تہذیب کے لئے چیلنج **سمجھکر** اسے مٹانے کے لئے ہر طرح کے حربے اختیار کرنے کا پہلو ہے۔ اس معاملہ میں مغرب کی جارحانہ روش ایسی ہے، جو خود انسانیت کے منافی ہے۔ محسن انسانیت حضورﷺ کی شان میں گستاخی جیسے مسلمانوں کے لئے نازک اور حساس دینی حمیت کے مسئلہ کو انہوں نے اپنی

تہذیب کی بقا کی جنگ کے لئے ناگزیر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا ہے، اس سلسلہ میں مسلمان حکمرانوں پر شدید دباؤ ہے کہ وہ حریت فکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ملکی قانون میں شان رسالت کے گستاخی کی مرتکبین کے لئے سزا کے خانہ کو کالعدم قرار دیں۔ پھر دینی مدارس کو بھی وہ اپنے لئے چیلنج محسوس کرتے ہوئے، ان کے خاتمہ کے لئے ہر ممکن حد تک کوشاں رہتے ہیں، اس کام کو وہ اپنی مادہ پرستانہ تہذیب کی بقا کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں، مسلمان حکمرانوں اور مسلم ریاست کے مؤثر طبقات کو مختلف طریقوں سے خرید کرکے، انہیں اپنے ملحدانہ مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی ان کی روش ایسی ہے، جس نے مسلمانوں میں اضطراب، تشویش اور ردعمل کی فضا پیدا کردی ہے۔

مغربی تہذیب کا پیدا کردہ یہ وہ بحران ہے، جس نے مغربی انسان کے کردار کے بعض اچھے پہلوؤں پر بھی پانی پھیر دیا ہے اور مسلم تجربہ نگار کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مغربی انسان ظاہری طور پر تہذیبی چمک دمک کے ساتھ باطن کے اعتبار سے مکمل طور پر تاریک اور ویران انسان ہے، جدیت فکر کے نام پر ان کی مادی تہذیب دراصل حیوانیت کی ترقی یافتہ شکل ہے، اس سے مختلف ہرگز نہیں اور وہ اسی حیوانی تہذیب کو مسلمانوں پر مسلط کرنے کے لئے ان سے عرصہ سے حالت جنگ میں ہے، عراق، افغانستان، مصر، لیبیا شام وغیرہ میں ان کی ساری کارروائیوں کا مقصود مادہ پرستانہ تہذیب کے غلبہ اور مسلمانوں کے وسائل پر قبضہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ مغربی تہذیب کی یہ وہ خرابیاں ہیں، جس نے اس تہذیب کو انسانیت کے لئے خوفناک بنادیا ہے۔

ہمارا تہذیبی انحراف اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ مغرب نے عرصہ سے ہم پر تہذیبی جنگ مسلط کی ہے، اپنے تعلیمی نظام کے تسلط کے ذریعہ وہ ہماری نسلوں کی نسلوں کو اپنی مادہ پرست تہذیب کا حامل بنا چکا ہے، یہ نسلیں جسمانی طور پر تو ہمارے ساتھ ہیں، لیکن وہ ذہنی وجدانی اور ونفسیاتی طور پر اہل مغرب کا حصہ ہیں، ان کی پسند وناپسند کے معیار وہی ہیں، جو اہل مغرب کے ہیں، وہ آزادی اور حریت فکر کے دلدادہ ہیں، سیکولرزم ان کے لئے نظریہ حیات کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، وہ مذہب کو پوجا پاٹ، بزرگوں کو نذرانہ دینے اور کچھ ظاہری رسوم کی ادائیگی سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہ وہ تہذیبی المیہ ہے، جس میں ہم اجتماعی طور پر عرصہ سے مبتلا ہیں۔

مغرب کی طرف سے مسلط کردہ اس جنگ اور اس بحران سے نکلنے کی صورتوں پر غور وفکر کرنا ضروری ہے۔

ایک بات واضح ہے کہ اسلام جس پاکیزہ تہذیب کا علمبردار ہے، وہ انسانی فطرت سے ہمہ آہنگ ہے، یہ تہذیب انسان کی ناگزیر ضرورت ہے۔

اس تہذیب سے وابستگی کے بغیر انسانیت سکون کی نیند سو سکے، ممکن نہیں، اگر ہم نے اپنی تہذیب کے تحفظ کے لئے مناسب اور موزون حکمت عملی کے ساتھ کام نہ کیا اور اس کے لئے اپنی توانائیاں خرچ نہ کی تو اللہ تعالیٰ خود مغرب کے اندر سے تلاش وتحقیق کا ذہن رکھنے والے ایسے افراد پیدا کرے گا، جو اسلامی تہذیب کے تحفظ وبقا کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ ہماری شعوری کوششوں اور منصوبہ بندی کے بغیر پچھلے سالوں میں لاکھوں مغربی انسان اسلام قبول کر چکے ہیں اور بہتر مسلمان کی حیثیت سے کردار ادا کررہے ہیں۔ یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ اسلامی تہذیب خود اپنے لئے جگہ بنارہی ہے، اسلام ہمارا محتاج نہیں، بلکہ ہم اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنی دنیا وعافیت کی بہتری کے لئے انسانیت کے لئے باعث رحمت تہذیب کے فروغ کے لئے کام کریں۔

ہمارے لئے بڑھتے ہوئے اخلاقی بحران سے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم تقویٰ، حکمت، بصیرت وبصارت، معرفت، خوداحتسابی اور باطنی علم کو فروغ دینے کے کام کو ترجیح دیں، اس کام کو تعلیم وتربیت اور اجتماعی نظام کی بنیاد میں شامل کریں۔ تاکہ افراد کی حیوانیت، درندگی، مادیت اور مادی جبلت پر ملکوتی وروحانی قوتوں کے غلبہ کی صورت پیدا ہو، پاکیزہ انسانی جذبات اجاگر ہوں، فطرت سے ہمہ آہنگی پیدا ہو، اور فطرت سے مطابقت رکھنے والے کردار کی نشوونما کی صورت پیدا ہو۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث ہماری شایع کردہ کتاب ''قوموں کے عروج وزوال میں نظام تعلیم کا کردار'' میں موجود ہے۔

خود اعتمادی کا بحران

معاشرہ کا سلگتا ہوا مرض

مختصر ہمہ پہلو گفتگو

اس دور کا ایک بحران، جس نے ذہین افراد کی زندگیوں میں زہر گھول دیا ہے، وہ مثبت سمت میں زندگی کے رخ کی تعمیر کے سلسلہ میں قوت فیصلہ اور حوصلہ وہمت کی کمی کا بحران ہے، جس نے معاشرہ کے بڑے قیمتی اور ذہین افراد کی صلاحیتوں کو معطل کردیا ہے، اور ڈپریشن کا شکار بناکر، انہیں اپنی ذات اور معاشرہ کے لئے المیہ بنادیا ہے، یہ ایسی تشویشناک صورتحال ہے، جسے دیکھ کر دل غم واندوہ سے بھر جاتا ہے، ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ ایک لڑکا غیر معمولی ذہانت کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہوتا ہے، اچانک معلوم ہوتا ہے کہ وہ غصہ، اشتعال، جھنجھلاہٹ اور سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہوکر ناکارہ ہونے کی راہ پر گامزن ہے، ایک فرد اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے شعبہ میں بہت آگے بڑھ رہا ہوتا ہے، بیک وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اعتمادی اور حوصلہ وہمت کے فقدان کا شکار ہوکر نفسیاتی ڈاکٹروں کے نرغے میں چلا گیا ہے اور نفسیاتی ڈاکٹر مغرب کے مادہ پرستی کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے طریق علاج کے ذریعہ ان کے ذہن کو مزید منجمد ومعطل کرنے اور ان کے خود اعتمادی کے بحران میں مزید اضافہ کرنے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

اس ساری صورتحال کے پیچھے اصل محرک جو کارفرما ہے، وہ خالص مادیت پرستی پر مشتمل ہمہ گیر ماحول ہے، جس نے فضا کو ظلمات سے تاریک تر کردیا ہے، ہمارا تعلیمی، انتظامی، سرکاری، تجارتی وکاروباری ماحول سارے کا سارا ظلمات سے سرشار ہوگیا ہے، افراد، ظلمات کی اس لپیٹ میں آکر، انسان کی خودشعور ہستی (جو انسان کی اصل ہستی ہے) اسے اس کے ذکر کی غذا نہ دینے کی وجہ سے یکے بعد دیگرے خود اعتمادی کے اس ہولناک بحران اور شدید ذہنی دباؤ کے امراض کا شکار ہورہے ہیں، اس طرح معاشرہ باصلاحیت افراد کی صلاحیتوں سے محروم تر ہوتا جارہا ہے، لگ بھگ ہر گھرانہ کا ایک نہ ایک فرد بری طرح اس بیماری کی لپیٹ میں آتا جارہا ہے۔

خود اعتمادی اور ہمت وحوصلہ کے فقدان کا بحران ایسا ہے، جو خالص روحانی نوعیت کا بحران ہے یہ بیماری بظاہر مادی نوعیت کی بیماری نظر آتی ہے کہ ذہن تھکاوٹ اور فکری انتشار کا شکار ہے اور اعصابی نظام معطل ہے، لیکن حقیقت میں یہ انسان کی خودشعور ہستی یعنی روح کے اشتعال کی بیماری ہے، روح کو جب اپنی حقیقی خوراک نہیں ملتی تو روح اپنے ساتھ وابستہ مادی چیزوں ذہن ونفسیات واعصاب میں بے چینی، بے یقینی، غصہ، اشتعال، بے چارگی اور بے بسی جیسی بیماریاں منتقل کرتا ہے، تاکہ فرد ہوشیار اور متنبہ ہوکر، اسے اس کی اصل غذا ذکر وفکر اور مخلصانہ عبادت کے ذریعہ محبوب حقیقی کے انوار حسن کے مشاہدہ کی صورت میں دینے کے لئے متحرک ہوجائے۔

لیکن بدقسمتی سے مادی ظلمات سے سرشار فضا میں رہتے ہوئے فرد وافراد روح کی اس پکار کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور وہ نفسیاتی ڈاکٹروں کی نذر ہوکر، زندگی بھر ان کے مطب کو کھٹکھٹانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

موجودہ مادی دنیا کا یہ اتنا بڑا فریب ہے (جس میں ہمارا معاشرہ بھی بڑی طرح مبتلا ہے) کہ خالص روحانی نوعیت کی بیماری کو ذہن اور نفسیات کی مادی نوعیت کی بیماری سمجھا گیا ہے، اس طرح روح اور روحانیت کی تشفی کی طرف آنے کے لئے راستے ہی مسدود کردیے گئے ہیں، اہل مغرب کے پاس اگر خود اعتمادی کے بحران اور بڑھتے ہوئے ڈپریشن کا مؤثر علاج موجود ہوتا تو وہاں ماہرینِ نفسیات کی بڑی تعداد موجود ہونے کے باوجود اس بیماری میں ہولناک اضافہ نہ ہوتا، سب جانتے ہیں کہ امریکہ سمیت یورپ میں ڈپریشن اور خودکشی کا ریشہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

مغرب کی یہ حالت زار ہمارے لئے سمجھنے اور بیدار ہونے کا ذریعہ ہے کہ ہم اپنے علوم کی طرف واپس ہوں، ہمارے ہاں معاشرہ میں صدیوں سے نفسیاتی بیماریاں اول تو کم تھی، اگر ہوتی بھی تھی تو مسلم ماہرینِ نفسیات یعنی اہل اللہ کی صحبت میں آنے اور ان کی خانقاہوں سے وابستگی کے نتیجہ میں روح کو ازخود اس کی غذا ملنا شروع ہوجاتی تھی، جس سے روح کی تشنگی اور اس کا اشتعال ختم ہوجاتا تھا، اس کی تشنگی سے دل، ذہن، نفسیات واعصاب ازخود حالت توازن میں آجاتے تھے اور ان کا ہر طرح کا تناؤ، بے یقینی اور دباؤ

ختم ہوجاتا تھا۔

خوداعتمادی کا بحران اور ڈپریشن کا جدید نفسیاتی طریق علاج وقتی طور پر توکسی حد تک افادیت کا حامل ہے کہ فرد کے ذہن کو سلا کر، اس کے احساسات کو مفلوج کردیا جاتا ہے، اس طرح لاشعور کو سکون ملنے کا پیام ملتا ہے، لیکن یہ طریق علاج فرد کے ذہن، دل اور نفسیات پر مستقل طور پر حقیقی دباؤ ختم کرنے میں ناکام ہے، سبب یہ ہے کہ انسانی شخصیت اور اس کی نفسیات کی نوعیت کو سمجھنے میں ناکامی ہوئی ہے۔

انسانی شخصیت جسے خودشعور ہستی کہیں یا روح کہیں، یہ شخصیت لازوال حسن کے مشاہدہ کی طالب ہے، یہ مشاہدہ ہی اس کی غذا ہے، روح میں مطلق خودشعور ہستی سے محبت کا ایسا والہانہ داعیہ موجود ہے کہ روح اس کے بغیر رہ نہیں سکتی، روح کو اس کی حقیقی غذا ملے بغیر اس کا نہ ختم ہونے والا اضطراب بڑھتا ہی رہے گا، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ روح کی حقیقی غذا کی فکر کئے بغیر ذہن اور نفسیات کو دواؤں کے ذریعہ چلاتے رہنا، ایسا ہے جیسے بہت بڑی دلدل میں پھنسے ہوئے فرد کو ہاتھ پاؤں مارنے کی تلقین کرتے رہنا، جس کا لازمی نتیجہ اس دلدل میں مزید پھنسے رہنے کے علاوہ کوئی دوسرا نکل ہی نہیں سکتا۔

مغربی تہذیب کے سایہ میں پروان چڑھنے والے افراد کے لئے اس نکتہ کو سمجھنا دشوار ہے، لیکن اگر وہ اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ڈپریشن کی مادی نوعیت کی موجودہ بیماری یہ خالص مادہ پرستی کی فضا کے غلبہ ہی کا نتیجہ ہے، مسلم معاشرہ اجتماعی طور پر اس بیماری سے ہمیشہ محفوظ رہا ہے، اگر بعض افراد میں یہ بیماری پیدا ہوتی بھی رہی ہے تو وہ مسلم ماہرین کی زیر صحبت آنے کی وجہ سے ازخود اس بیماری سے محفوظ ہوجاتے تھے، اس لئے کہ پاکیزہ صحبت کی طاقتور مثبت شعاؤں کی منتقلی کی وجہ سے دل اور ذہن پر پڑنے والی منفی شعاؤں کے اثرات کاالعدم ہوجاتے تھے۔ ہمارے جدید طبقات کو اپنی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ سے وابستگی ضروری ہے، اسی میں اس کی دنیا وآخرت کی بھلائی ونجات وابستہ ہے، اس کے لئے انہیں مغربی فکر کی ذہنی غلامی سے نکلنا ہوگا۔

یاد رکھیں، مغربی فکر اور مغربی تہذیب کا نتیجہ روح کا جلا کر بھسم کرنے اور ذہنی ونفسیاتی بیماریوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ کا علاوہ کچھ نکل سکے، ممکن ہی نہیں، مغرب کا قومی اخلاق، کاروباری اخلاق، قانون کی حکومت بہتر عدالتی وانتظامی نظام ڈسپلن وغیرہ انہیں اس تباہی سے بچانے میں کسی طور کامیاب نہیں، مغرب کا انسان ظاہری خوبصورتی کے پردے میں باطن میں بڑھکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں رہ رہا ہے، جو انہیں زندگی سے بے زاری، بے یقینی، خودکشی، سب سے بیزاری اور صرف اور صرف اپنی ذات میں مگن رہنے اور ترقی یافتہ حیوان کی حیثیت سے زندگی گذارنے کی راہ پر گامزن کر رہا ہے۔ کہاں مادی نوعیت کے اصولوں کے ساتھ ترقی یافتہ حیوانی زندگی کا مظاہرہ اور کہاں اسلام کا پاکیزہ اخلاقی روحانی تعلیمات پر مشتمل نظام زندگی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان دونوں میں سے کسی ایک ہی تہذیب کو اختیار کریں۔ مغربی تہذیب کے حاملین کا حشر سامنے ہے کہ رحم وشفقت سے محرومی خودکشی وڈپریشن کی بڑھتی ہوئی بیماری۔ جب کہ اپنی اخلاقی وروحانی ومعاشرتی تعلیمات افراد کو نفس مطمئنہ کا حامل بنا دیتی ہے۔

مغربی تہذیب کے علمبردار مادہ پرستی کی آگ کے یہی شعلے جدید طاقتور میڈیا اور دولت کی ریل پیل کے ذریعہ ہماری نسلوں میں بھی منتقل کرنے میں کامیاب ہوچکا ہے، جو ہمارے لئے تباہی کا پیش خیمہ ہے، ہمیں اپنی نسلوں کو اس تباہی سے بچانے کے لئے بہتر اور مؤثر حکمت عملی سے کام کرنا ہوگا۔

نفس کی پُرفریب ادائیں

اور ان سے بچاؤ کی صورتیں

تحلیل نفسی سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کی گہرائیوں میں خواہشات کا ایک طوفان موجود ہے، جو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا، طویل عرصہ کے ذکر وفکر کے مجاہدوں کے بعد کہیں جا کر اس طوفان کی سرکشی میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس دوران اگر فرد، قیادت اور عہدوں پر فائز ہوگیا، یا اسے بزرگی کی مسند حاصل ہوگئی یا اسے اپنی علمی وخطیبانہ صلاحیتوں کے ذریعہ مقام حاصل ہوگیا تو ایسا فرد عام طور پر نفسی قوتوں کے حوالے ہوجاتا ہے اور منصب، دولت وشہرت اس کے باطن سے چپکے رہتے ہیں۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی بڑی اکثریت بالخصوص قیادت، امامت، سرداری اور شیخوخیت کے مقام پر فائز افراد کی طرف سے انبیاء کرام کی آخری حد تک مخالفت کا بنیادی سبب نفس کی گہرائیوں میں موجود خواہشات کا طوفان اور بڑے پن کے جذبات ہی رہے ہیں۔

اس وقت بھی انسانیت کا سب سے بڑا بحران اور المیہ یہی ہے کہ فرد وافراد نفس سے مجاہدوں کے ذریعہ معرکہ آرائی کرکے، اسے شکست دینے اور زیر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تصوف وبزرگی کے نام پر بھی عام طور پر دولت وشہرت اور مال کے جذبات اور اس کے مظاہر عام ہیں۔

سبب وہی ہے، جس کا ذکر ہوا کہ نفسی قوتیں آسانی سے مطیع نہیں ہوتی، نفس مطمئنہ کا مقام غیر معمولی مجاہدوں کے بعد کہیں جا کر حاصل ہوتا ہے۔ اس مقام تک رسائی سے پہلے، خلافت، بزرگی، امارت وسیاست وقیادت اور شیخوخیت، یہ نفس پروری کے ذرائع ووسائل ہیں اور فرد کے لئے مضر رساں ہے۔

فرد کو باطن کو روزانہ ذکر کی اتنی خوراک ومقدار دینا ضروری ہے، جس سے نفس کا سانپ پھنکار مارنے اور زہر اوگاڑنے سے باز رہے۔ ورنہ اس کے ہاتھوں لوگوں کی عزت وحرمت سلامت نہ رہے گی۔

نفس اپنی الوہیت سے کم پر راضی نہیں ہوتا، اپنے علاوہ سب کی تکذیب وتردید کرنے کے اس کے پس منظر میں عام طور پر الوہیت کا یہی داعیہ کارفرما ہوتا ہے۔

امامت وسیادت، شیخوخیت وکسی انجمن وتنظیم کی صدارت ملنے کے بعد تو اس کی سرکشی وبے قابو پن میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ آپے سے باہر نکل جاتا ہے، اس لئے کہ اپنی شیخوخیت اور امامت سے یہ مالی خولیا کا مریض ہوجاتا ہے اور اسے اپنے علاوہ سب ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔

نفس کی طرف سے بڑے پن کے حملے آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اور وہ باطن کو تاریک سے تاریک تر کردیتے ہیں اور اس کی انسانیت کو پامال کردیتے ہیں۔

دنیا کی یہ ساٹھ ستر سال کی زندگی جس میں کل شعوری زندگی چالیس پچاس سال بمشکل ہوتی ہے، اتنی مختصر زندگی کو مال ودولت سے مزین کرنے، شہرت اور بڑے پن کے مظاہر کے ساتھ گذارنے اور دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کے تقاضوں کے تحت بسر کرنے کی روش ایسی ہے، جو سب سے بڑے خسارہ کا سودا ہے۔ ایسا خسارہ، جس کے نتیجہ میں مدتوں خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ نفس، فرعون اور قانون بننے سے کم پر راضی نہیں ہوتا، فرد کو جوں جوں مواقع میسر ہوتے چلے جاتے ہیں وہ اسی مناسبت سے فرعونیت وقارونیت کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن چند دنوں کی یہ فرعونیت وقارونیت اور دعویٰ الوہیت کس کام کی؟

جب کہ اسے فرعونیت وقارونیت کے نتائج خود اس دنیا میں بھی بھگتنے پڑتے ہیں کہ اس کا سکون برباد ہوجاتا ہے، اس کی زندگی سے خیر وبرکت رخصت ہوجاتی ہے، اللہ کی غریب مخلوق کی دلوں میں اس کی عزت وتوقیر باقی نہیں رہتی۔

چھوٹا بن کر رہنا، اللہ کے بندوں کو اپنے جیسا بندہ سمجھکر، ان سے شفقت ومحبت کا معاملہ کرنا، سادہ زندگی گذارنا، صبر وشکر کے ساتھ وقت گذارنا، اپنی شیخوخیت سے مکمل طور پر دستبردار ہونا، شان ومان کی طرز زندگی سے قطع کرنا، یہی وہ حقیقی زندگی ہے، جو اہل اللہ کا امتیازی شان ہوتی ہے، اس کی وجہ سے وہ سکینت سے

بہرہ ور ہوتے ہیں اور ان کی زندگی پاکیزگی کا نمونہ بن جاتی ہے۔ وہ شہرت سے بھاگتے ہیں۔ وہ اللہ کی مخلوق میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے خوشخبری سنائی گئی ہے۔ (وبشر المخبتین)۔

اس طرح کی زندگی ہی وہ مثالی و پاکیزہ زندگی ہے، جس پر دنیا کی ساری دولت اور ساری نعمتیں فدا کی جا سکتی ہیں۔ ہر انسان کی روح اسی طرح کی پاکیزہ اور حلاوت سے بھرپور زندگی کی طالب ہے، لیکن نفسی قوتیں دل، روح اور عقل کو یرغمال کرکے، اسے خوشحال مادی زندگی اور انانیت وشہرت سے بھرپور زندگی کو مقصود بنانے کی راہ پر گامزن کرتی ہیں۔

نفس جو سب سے بڑا طاغوت ہے، اس سے مقابلہ کرکے، اسے حقیقی اہل اللہ کے نقوش وخطوط پر چلانا ناگزیر ہے، اسی سے سعادت دارین وابستہ ہے۔

نفس کا ایک محبوب مشغلہ دوسروں کی تحقیر سے لذتیات ہونے کا ہے، چونکہ دوسروں بالخصوص معاصر شخصیتوں کی تحقیر سے اس کی انانیت کے جذبات کو تسکین ملتی ہے، اس لئے وہ غیبت اور ان کی تحقیر کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ بزرگی کے روپ میں بھی اس بیماری سے بچاؤ کی بمشکل صورت پیدا ہوتی ہے۔

نفس کا دوسرا محبوب مشغلہ کثرت گوئی اور لایعنی وغیرضروری گفتگو میں قیمتی وقت کا استعمال ہے۔ جب ذکر وفکر اور صحبت اہل اللہ کے مسلسل عمل سے محرومی ہوتی ہے تو اس کی نقد سزا قیل قال، لایعنی گفتگو اور دنیا بھر کی باتوں میں مشغولیت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

جب کہ یہ حقیقت ہے کہ غیرضروری ولایعنی گفتگو سے قلب میں سیاہی پیدا ہوتی ہے اور قساوت قلبی کے مرض کے فروغ پذیری کی صورت پیدا ہوتی ہے اور قساوت قلبی ایسی بیماری ہے، جس سے دوسری بہت ساری بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے ذکر کے سوا کثرت سے گفتگو نہ کیا کرو، اس لئے کہ کثرت گفتگو سے قساوت قلبی پیدا ہوتی ہے، دنیا بھر کی باتوں وحالات کے حوالے سے قیل وقال کا حربہ نفس کا طاقتور ترین حربہ ہوتا ہے۔ اس تیر سے وہ بہت سارے شکار کرلیتا ہے، ایک یہ کہ فرد کو ذکر سے دور کردیتا ہے، دوم یہ کہ اس کے دل میں سیاہی وکدورت پیدا کر دیتا ہے۔ سوم یہ کہ اس کے قیمتی وقت کا ضیاع کردیتا ہے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے فرد کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ غیرضروری باتوں سے احتراز کرے۔

نفس کی اس طرح کی ساری بیماریوں کا آخری علاج مستقل طور پر خود احتسابی سے کام لیتے رہنے سے وابستہ ہے۔ نفس، جب بھی خودسری کا مظاہرہ کرے، اس وقت اسے زبانِ قال وزبانِ حال سے کہنا چاہئے کہ اپنی حیثیت کو پہنچان، اپنے گناہوں کے استحضار سے کام لے، اللہ کے بندوں میں سب سے سیاہ کار تم ہی تو ہو، اپنی اس حالت کے ہوتے ہوئے دوسروں کی عیب جوئی کرنا، انہیں گرانے کی کاوش کرنا، اپنے آپ کو رحمت خداوندی سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

نفس کے ساتھ اس طرح کا مکالمہ کرتے رہنے اور مستقل اس کی خوداحتسابی کرتے رہنے سے انشاء اللہ اس پر قابو پانے میں آسانی ہوگی۔

نفس کی جن بیماریوں کا ذکر ہوا، یہ خرابیاں زیادہ تر اہل ثروت، اہل اقتدار، اہل علم اہل دانش اور مبتدی ومتوسط وخام صوفی میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ عام لوگوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک یہ خرابیاں موجود ہوتی ہیں، لیکن مال ودولت، اقتدار، علم اور روحانیت کا غرور ان خرابیوں کو مزید طاقتور بنانے کا ذریعہ بنتا ہے، اس لئے ان طبقات کی یہ نفسی خرابیاں زیادہ شدید صورت اختیار کر جاتی ہیں۔

نفس کو مال ودولت اور سامان راحت سب سے زیادہ مرغوب ہیں، وہ انہی چیزوں سے دل بہلاکر، ان کو زندگی کے اہداف میں شامل کر لیتا ہے۔

وہ صوفی جو نفس کی فنائیت سے پہلے اس مسند پر فائز ہوتا ہے، اس کا باطن بھی دولت، دنیا اور شان وشوکت کے سامان سے متمتع ہونا چاہتا ہے، اس کے لئے اس کا نفس تاویلات کا ایک سلسلہ اس کے سامنے پیش کرتا ہے، حالانکہ اگر وہ دل کے مفتی سے فتویٰ معلوم کرے تو دل کا مفتی اس پر ان چیزوں کے مضر اثرات ظاہر کرلیتا ہے، لیکن وہ اس معاملہ میں اتنا آگے بڑھ چکا ہوتا ہے کہ وہ دل کے مفتی سے پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتا۔

دل کے مفتی سے نہ سہی، سنت نبوی اور احادیث پر ایک نظر ڈالنے سے بھی اس پر

اس روش کے نقصانات واضح ہو سکتے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ساری زندگی حالت فقر میں بسر فرمائی۔ اور فقر کو اپنے لئے فخر قرار دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جس طبقہ اور گروہ میں دولت آئے گی، ان میں دشمنی پیدا ہوگی اور وہ آپس میں دست وگریباں رہیں گے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ عالم، دین کے امین ہیں، لیکن جب وہ مالداروں سے تعلقات قائم کریں گے تو وہ دین کے رہزن بن جائیں گے۔

اس حدیث شریف سے واضح ہوتا ہے کہ دولت اپنے ساتھ حسد وجلن رقیبانہ، جذبات واحساسات کی بیماری لاتی ہے۔ اور جس طبقہ وگروہ کے بعض افراد دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، اس گروہ کے دولت سے محروم افراد کی دلوں میں ان سے کدورت پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دوم یہ کہ اس گروہ کے افراد ایک دوسرے سے دولت کی چھینا جھپٹی کی ایسی کشمکش سے دوچار ہوجاتے ہیں کہ افراد کی بیشتر قوتیں اسی تصادم میں خرچ ہوجاتی ہیں۔ دولت کے تنازعات کے حوالے سے معاملات سلجھنے ہی نہیں پاتے۔

دولت کا بڑا نقصان یہ ہے کہ دولتمند عام طور پر اپنے گروہ اور اپنے طبقہ کے مفلس افراد کی فکرمندی اور خبرگیری سے عاری ہوتے ہیں۔ خود تو شاہانہ زندگی اور راحت کے ہرطرح کے سامان سے متمتع ہوتے ہیں، جب کہ اپنے طبقہ کے محروم افراد کی مدد کی ان کی حس مسدود ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس طبقہ وگروہ کے محروم افراد میں احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ احساس کمتری انہیں اپنے ہی طبقہ کے مالدار افراد کے خلاف ردعمل کی نفسیات پیدا کردیتا ہے۔ اس کے مظاہر ہر شہر، ہر محلّہ اور ہر گاؤں میں ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ اللہ کے رسول کے اس فرمان کی صداقت موجودہ دور سے زیادہ کس دور میں بین طور پر ظاہر ہوتی نظر آئے گی۔

دوسری حدیث میں یہ نکتہ بیان فرمایا گیا ہے کہ عالم جب مالداروں کی صحبت اختیار کرے گا اور ان سے دوستانہ تعلقات مستحکم کرے گا تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کا دل ان سے متاثر ہوگا اور اس طرح مالداروں کے حب جاہ وحب مال کے اثرات اس کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے، جو اسے دنیاداری اور خواہشات نفس کی پیروی کی راہ پر ڈالنے کا ذریعہ بنے گے۔

جب صوفی اور شیخ، سرمایہ داری اور مالداری والی زندگی اختیار کرتا ہے تو اس طرز زندگی سے دراصل وہ اپنے متوسلین اور عام لوگوں کو یہ پیام دیتا ہے کہ سرمایہ دارانہ زندگی، مثالی اسلامی تعلیمات کے منافی ہرگز نہیں، ایک مسلمان سرمایہ دار بن کر سرمایہ دارانہ مظاہر زندگی اختیار کرسکتا ہے۔ یہ ایسا پیام ہے، جو صوفی اور شیخ کی طرف سے ملنے کے نتیجہ میں اس کے حلقہ اثر سے مادی زندگی اور مسرفانہ زندگی سے کراہت وبیزاری ختم ہوجاتی ہے، اس طرح سرمایہ داروں کے لئے مادی زندگی کو فروغ دینے اور اپنی نت نئی مادی اشیاء کی فروخت کے لئے حالات سازگار ہوتے چلے جاتے ہیں، اس طرح بالواسطہ طور پر سرمایہ دارانہ کلچر کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ عام افراد اور صوفی کے درمیاں حجابات پیدا ہونے لگتے ہیں اور عام فرد کا یہ احساس غالب ہونے لگتا ہے کہ صوفی ہماری سطح سے بلند ہوکر، سرمایہ دارانہ سطح میں داخل ہوگیا ہے۔ تیسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ عام لوگوں میں احساس محرومی جنم لیتا ہے کہ بزرگی کے نام پر صوفی کو راحت کا جملہ سامان میسر ہے، جب کہ ہمیں علاج ومعالجہ کے وسائل تک میسر نہیں۔

اس ساری صورتحال کے اسباب کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ صوفی اور شیخ، سلوک کی تکمیل سے پہلے ہی اس منصب پر فائز ہوا ہے یا فائز کردیا گیا ہے، اس لئے کہ اکابر بزرگان دین کا کہنا ہے کہ تکمیل سلوک کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مادی دنیا کے حوالے سے فرد کے جذبات سرد ہوجاتے ہیں۔ آخرت کا استحضار غالب ہوجاتا ہے اور دنیا سے بقدر ضرورت استفادہ کا مزاج راسخ ہوجاتا ہے۔ معاشرہ میں اپنی شخصیت کے استحکام اور شہرت جیسے احساسات کالعدم ہوجاتے ہیں، تکمیل سلوک ہی سے تزکیہ کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جب صوفی سے مادی زندگی کے مظاہر ہونے لگیں اور شان ومان والی اس کی زندگی کی اداؤں کے اثرات دوسروں میں منتقلی کا ذریعہ بنیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تکمیل سلوک میں کمی واقع ہوئی ہے۔ جب تک سلوک کی تکمیل کا عمل مکمل نہ ہوگا، صوفی کی اس حالت میں تغیر واقع نہیں ہوگا اور شہرت ومان کی دھن اس پر غالب ہوگی، وہ طرح طرح کی تاویلات کے ذریعہ مال وشہرت کے لئے جواز تلاش کرتا رہے گا۔

تکمیل سلوک جزوی طور پر اسباق طے کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ تکمیل سلوک کے لئے زندگی کا قابل ذکر حصہ نفس سے حالت جنگ میں رہنے اور اسے مسلسل ذکر وفکر اور صحبت صالحہ کی خوراک دیتے رہنے سے وابستہ ہے، جب تک حب مال وحب جاہ کے

جذبات فنا نہیں ہوتے، بزرگی کے مقام پر فائز ہو کر مرید بنانے کی خواہشیں کالعدم نہیں ہوتی اور ہمہ وقت اپنی اصلاح کی فکر غالب نہیں رہتی اور ذکر وفکر سے طبعی مناسبت پیدا ہوکر وہ مزاج کا حصہ نہیں بنتے، اس وقت تک تکمیل سلوک کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے بزرگی کے مقام پر فائز ہونا اپنے آپ کو خطرات میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے ساتھ ساتھ تصوف کے پاکیزہ ادارہ کو نقصان پہنچانا بھی ہے۔

بدقسمتی سے اس دور میں تصوف نے بہت بڑے کاروبار کی صورت اختیار کر لی ہے، تصوف کے نام پر جگہ جگہ نئے نئے سرمایہ دار ومالدار سامنے آئے ہیں۔ جنہوں نے سلف کے اس پاکیزہ ادارہ کو دنیاداری کے روپ میں بدل دیا ہے۔ ان حالات میں تصوف کی حمایت ووکالت کرنا بجائے خود امتحان وآزمائش ہے۔

بعض طالبوں کو اس تشویش میں مبتلا ہوتے دیکھا ہے کہ راہ سلوک میں دس بارہ سال سے چل رہے ہیں، لیکن اب تک نسبت حاصل نہ ہوئی۔ حقیقی اہل اللہ، طالبوں کو جس طرح مجاہدوں میں چلاتے ہیں، ان طلبہ کی اکثریت اس طرح کی سوچ کا شکار ہوجاتی ہے۔ اس سوچ کا ایک مطلب یہ ہے کہ طالب کا نفس چاہتا ہے کہ اس کا سلوک جلد طے ہو، تاکہ وہ بزرگی کے منصب پر فائز ہو سکے۔ یہ سوچ، نفس کی فریب ومکر کا شاخسانہ ہوتی ہے، لیکن چونکہ حقیقی اہل اللہ سمجھتا ہے کہ نفس کی گھاٹیاں طے کرنا آسان کام نہیں، یہ بچوں کا کھیل نہیں، اس میں جان فدا کرنی پڑتی ہے اور نفس کو طویل عرصہ کے لئے جدوجہد کے لئے آمادہ کرنا پڑتا ہے، اس لئے وہ طالبوں کی اس سوچ کو فریب نفس میں شمار کرتے ہیں، وہ انہیں نسبت یا خلافت سے نہیں نوازتے، اس لئے کہ قبل از وقت نسبت اور خلافت کا پروانہ دینا طالب کو شدید آزمائشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور اسے شہرت ومالداری کی راہ پر لگانا ہے۔

بعض طالب بڑی معصومیت سے کہتے ہیں کہ راہ سلوک میں طویل عرصہ سے چل رہے ہیں، لیکن نسبت عطا نہیں ہوئی، یعنی خلافت کا پروانہ نہیں ملا، ان طلبہ کو معلوم نہیں کہ اکابر بزرگوں کو نفس کی گھاٹیاں طے کرنے میں کتنا طویل اور دشوار گذار سفر طے کرنا پڑا ہے۔ کتابوں میں اکابر بزرگوں کے مجاہدوں کی تفصیل دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ انہیں تیس تیس، چالیس چالیس سال شب وروز مجاہدوں سے گذرنا پڑا ہے، اس کے بعد کہیں جا کر وہ اخلاص کے بلند مقام پر فائز ہوئے ہیں اور دوسروں کو فیض رسانی کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔

فرعون نفس کی سرکشانہ موجوں سے بچنے کے لئے درج ذیل تدابیر ہوسکتی ہیں۔

(۱) امامت، سیادت، قیادت، امارت، شیخوخیت، بزرگیت اور عہدوں کو مسترد کرنے کی روش پر مستقل مزاجی سے گامزن رہنا چاہئے (اس لئے کہ یہی چیزیں فرد کی ہلاکت کا سبب بنتی ہیں)۔

(۲) زندگی بھر چھوٹا بن کر رہنے کا سلیقہ سیکھتے رہنا چاہئے، اور چھوٹے پن کی سطح سے آگے بڑھنے کی ہرگز کوشش نہ کی جائے (ورنہ مارا جائے گا)۔

(۳) جذبہ شہرت جو نفس کا سب سے بڑا فریب ہے، اس سے بچنے کی ہر ممکن حد تک کوشش کرنی چاہے۔ نفس اگر بزرگی کی آڑ میں اپنے گرد لوگوں کا بہت بڑا مجمعہ جمع کرنے پر اُکسائے اور شہرت کے جدید ذرائع استعمال کرکے اپنی بزرگی کو مستحکم کرنے کی کاوشوں پر ابھارے تو اس کی شدت سے مزاحمت کرنا چاہئے۔

(۴) زندگی کی آخری سانسوں تک حقیقی اہل اللہ جو صاحب فقر وفنائیت کے حامل ہوں، ان کا دامن پکڑتے رہنا اور ان کی صحبت سے کسی بھی مرحلہ پر دستکش نہ ہو۔

(۵) اس نکتہ کو گرہ سے باندھ لے کر جو سر اٹھا کر چلتا ہے، مار اسی پر پڑتی ہے اور دوسروں کا بوجھ بھی تنہا اسے ہی اٹھانا پڑتا ہے، کھجور کا درخت اس کی واضح مثال ہے کہ وہ جتنا اونچا ہوتا ہے، اسی قدر وہ بوجھ سے لدی ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ کدو اپنا سر زمین پر رکھتا ہے، اس لئے اس کا سارا بوجھ زمین اٹھا لیتی ہے۔

نفس سے یہ نکتہ ہضم کرانے سے ہی فرد دنیا وآخرت میں مار سے بچ سکتا ہے۔ ورنہ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

(۶) اہل اللہ (جن کی صحبت کا ذکر ہوا) وہ نہ پیر ہوتے ہیں اور نہ ہی امامت وقیادت وشیخوخیت کے مقام پر فائز ہوتے ہیں، وہ حقیقت میں خادم ہوتے ہیں، وہ بڑے بننے، مریدوں کے انبوہ جمع کرنے، دولت جمع کرنے اور شان مان کی زندگی گذارنے کی آرزوؤں سے بچے ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر پامال کر چکے ہوتے ہیں، ان کی نفس کی پامالی ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح کے اہل اللہ کی صحبت کو لازم پکڑنا چاہئے۔

صوفی کے بعض حجابات

اپنے نفسی حالات کے پس منظر میں

درج ذیل مضمون اپنے نفس کے حالات کو پیش نظر رکھکر اس کی اصلاح ویاددہانی کے لئے لکھا گیا ہے۔

زیر نظر مضمون میں دوسروں سے زیادہ اپنے نفس کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ صوفی کا دعویٰ ہونے کے باوجود نفس کی یہ خواہش کہ صاحبِ مال، صاحبِ سرمایہ اور صاحب اقتدار افراد اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہوں، تاکہ مال حاصل ہو اور شہرت کے راستے ہموار ہوں، صوفی ہونے کے باوجود عام لوگوں سے بلند معیار زندگی کی آرزوں کا ہونا اور ان آرزوں کی عملی صورت اختیار کرنا اور مال کو مادی لذتوں اور شان وشوکت کے لئے استعمال کرنا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو اہل تصوف کے اصولوں اور اہل تصوف کے مزاج کے منافی ہیں اور بزرگانِ دین کے حالات زندگی، ان کی ملفوظات اور ان کے مواعظ کی کتابیں پڑھتے ہیں تو ان میں سب سے زیادہ جو چیز قدر مشترکہ ملتی ہے، اور ان کے ہاں جس چیز پر سب سے زور ملتا ہے وہ دنیا واہل دنیا سے بے نیازی اور جسم وپیٹ کو لذتوں سے بچانے اور سادہ طرز زندگی ہے، بعض بزرگوں کے ہاں مال بھی رہا ہے، لیکن انہوں نے مال کو نہ تو اپنی آسائش کے لئے استعمال کیا اور نہ ہی اس سے اپنی زندگی کے معیار کو بلند کیا، جب کہ اس وقت ہم جیسے صوفیائے خام کا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا باطن مال کے جذبات واحساسات سے سرشار ہے۔ وہ دنیا سے استغنا کے لئے کسی صورت تیار نہیں۔ اور نفس، مال کے لئے نئی نئی تاویلات سامنے لاتا رہتا ہے۔

زیر نظر مضمون اپنے انہی جذبات واحساسات کو مضمحل کرنے اور اسے تعمیری رخ دینے کے لئے لکھا گیا ہے۔ نفس کو مسلسل یاد دہانی ضرورت ہے، تاکہ اس کی اصلاح کی صورت پیدا ہوسکے، مضمون میں بالواسطہ طور پر مجھ جیسے دوسرے صوفیائے خام کے لئے اس میں غور وفکر کا مواد موجود ہے۔

مضمون میں شامل نکات کو نفس غیر اہم سمجھکر اسے مسترد کرنے کی کوشش کرے گا، اس لئے کہ اس دور میں تکاثر فی المال کی بیماری نفسیات کا حصہ بن چکی ہے اور مادیت کے عالمگیریت اثرات نے دور جدید کی ساری سہولتوں اور آسائشوں سے استفادہ کے مزاج کو مستحکم کر دیا ہے، اس لئے تصوف کو سلف صالحین کے اصولوں اور ان کے مزاج سے بالکل یکسر دوسرے رخ یعنی نفس کی آسائشوں کے رخ پر لانا ہم جیسے صوفیاء خام کا وتیرہ بن چکا ہے۔

جب تصوف کی مسند پر فائز افراد کی یہ حالت ہوگی تو عام افراد کی تکاثر فی الحال کی بیماری سے بچاؤ کی صورت کس طرح پیدا ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح کی صورت پیدا فرمائے۔

محمد موسیٰ بھٹو

(۱)

نفس کی کامل اصلاح جس پر جہنم کی سزا سے بچاؤ اور جنت میں داخلہ کی وعید وخوشخبری ہے **فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقد فاز** (جو جہنم سے بچایا گیا اور جنت میں داخل ہوا حقیقت میں وہی کامیاب ہے)۔

مادی دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینا اور اس مزاج کو راسخ کرنا، یہ کام بھی ایسا ہے جو فرد وافراد کی نجات کے لئے ناگزیر ہے۔ **فامامن طغیٰ واٰثر الحیوٰۃ الدنیا فان الجحیم ھی الموئیٰ وامامن خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ** (جس نے سرکشی (کی زندگی) اختیار کی اور دنیا کو ترجیح دی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور نفس کو خواہشات سے روکتا رہا اس کے رہنے کی جگہ جنت ہے)۔

نفسی قوتوں وخواہشات کو پامال کرنا اور دنیا کی مادی زندگی کو ترجیح دینے سے بچنا،

یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں، جو ساری دینی تعلیمات کا حاصل ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم اگر عام افراد کو چھوڑ کر خواص یعنی اہل تصوف کا جائزہ لیں گے تو اطمینان بخش صورتحال نظر نہیں آتی، اصلاح نفس اور دنیا کو ترجیح دینے کے معاملہ میں حالات کافی تشویشناک نظر آتے ہیں۔

اہل تصوف کے ہاں اللہ سے والہانہ محبت، اسلامی شریعت پر اخلاص واستقامت سے عمل پیرا ہونے کی صلاحیت کے بعد فقر کی زندگی کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔

لیکن ہم جیسے خام صوفی جو نفس کو پامال کرنے میں ناکام رہتے ہیں، ان کے لئے فقر کی راہ دشوار تر ہوتی ہے اور پھر نفس، دنیا سے بھرپور استفادہ اور شان ومان کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے ہمارے سامنے تاویلات کی نئی نئی صورتیں پیش کرتا رہتا ہے کہ مادی دنیا کی آسائش ہمارے لئے ہی تو ہیں۔غیروں سے زیادہ ہم ہی تو اس کے مستحق ہیں، اگر شان ومان کی زندگی گزاری اور سرمایہ داروں ومالداروں سے مشابہت پیدا کرلی تو آخر اس سے بزرگی میں فرق ہی کیا واقع ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

فقر کی مثالی صورت تو وہی ہے جو حضورﷺ کی زندگی میں نظر آتی ہے کہ شام تک جو بھی مال آتا تھا، رات کو سونے سے پہلے تک اسے اللہ کی راہ میں خرچ کردیتے تھے۔ اپنے لئے کچھ بھی نہ رکھتے تھے، اکابر بزرگان دین میں سے بہت سارے اکابر کی زندگی بھی اسی فقر محمدی کی عکاس تھی۔

فقر کی دوسری صورت یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ دولت کی فکر نہ کی جائے اور نہ ہی اس کا اہتمام ہو۔

فقر کی ان دونوں صورتوں میں موجودہ دور کی مالدارانہ روش کی سرے سے کوئی گنجائش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ضرورت کی چیزوں میں سادہ لباس، سادہ غذا، سادہ مکان اور سادہ سواری شامل ہے۔

یہی فقر اہل اللہ کی علامت اور ان کی امتیازی شان رہی ہے۔فقر کی اسی طرز زندگی اور اسی شاہانہ ادا سے ہی اکابر بزرگان دین ہر دور میں معاشرہ کے رخ کو موڑنے میں کامیاب رہے۔ اس دور میں اہل تصوف معاشرہ میں مثبت سمت میں تحرک پیدا کرنے میں اس لئے کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں کہ وہ عام طور پر فقر کی دولت عظمیٰ اور سعادت فقر سے تہی دامن ہیں۔

دراصل ہم جیسے خام صوفیوں کی فقر کی دولت سے تہی دستی میں تین اسباب کارفرما ہوسکتے ہیں۔

پہلا اور سب سے اہم سبب جو اس میں کارفرما ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حقیقی اہل اللہ (جو اہل فقر بھی ہوتے ہیں) ان کی طویل عرصہ تک کی صحبت نصیب نہیں ہوتی۔

صحبت اہل اللہ ایسی چیز ہے، جس کا کوئی بدل ہی نہیں، یہ صحبت ہی ہے، جس سے زہد وفقر اور اپنے آپ کو مٹانے کی ادائیں راسخ ہوتی چلی جاتی ہیں، نیز طبیعت میں اہل اللہ کے ان پاکیزہ اوصاف کی عکس ریزی کا عمل جاری رہتا ہے۔

صحبت کے عمل میں جتنی کمی واقع ہوگی، ان اوصاف کی منتقلی کے عمل میں اسی نسبت سے رکاوٹیں پیدا ہوتی جائیں گی۔

پہلے بزرگوں کے ہاں کسی بھی فرد کی صالحیت وعرفانی حالت کو جانچنے کا معیار یہ ہوتا تھا کہ اہل اللہ کی صحبت کا اس کا دورانیہ کیا ہے، اگر وہ دورانیہ کم ہوتا تھا تو وہ اس کے تزکیہ اور صالحیت کے بارے میں متردد ہوتے تھے۔

اس کا دوسرا سبب ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی مکمل طور پر پامالی سے پہلے بزرگی کے مقام پر فائز ہونا ہے، پہلے بزرگوں کے ہاں دس سال کے شب وروز کے ذکروفکر کے مجاہدوں کے بغیر سلوک طے کروانے اور خلافت دینے کی روایت نہیں تھی۔ (یہ سلوک کی تکمیل کا کم سے کم دورانیہ تھا) اس لئے کہ کثرت ذکر کے انوار سے ہی نفس کے بت ٹوٹنے لگتے ہیں اور ان بتوں کی پرستش سے نجات کی صورت ملتی ہے، موجودہ دور میں مادیت پرست قوتوں نے نفس کے بتوں کی سنگینی میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے، اس دور میں نفس سے فنائیت کے مراحل طے کرانے کے لئے پہلے کے مقابلہ میں ذکر وفکر کے زیادہ مجاہدوں کی ضرورت ہے۔

تیسری چیز مالداروں اور دنیا کو مقصود بنانے والوں کی صحبت ودوستی سے خصوصی احتراز کی روش ہے، جو اس دور میں ہم جیسے خام صوفیوں کے لئے دشوار ہوگئی ہے، اس لئے کہ دنیا کی آسائشیں اور مادی سامان سے متمتع ہونے کی آرزوئیں نئی نئی صورت میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔

جب ان تینوں میں سے کوئی بھی ایک سبب موجود ہو تو صوفی خطرہ سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ یا تو اپنے کشف وکرامات اور دوسری دنیا کے مشاہدات پر نازاں ہوکر، اپنی مزید اصلاح سے غافل ہوجاتا ہے، یا مریدوں میں اضافہ کو اپنی بزرگی اور اپنے کمال کا باعث سمجھنے لگتا ہے۔ یا زہداور فقر کی بجائے دولتمندوں والی زندگی اختیار کرنے لگتا ہے۔

اپنی بزرگی پر ناز، اپنے کشف وکرامات پر ناز، معاشرہ میں ملنے والی حیثیت وشہرت پر ناز، مریدوں میں اضافہ پر ناز، زیادہ سے زیادہ دولت آجانے کی وجہ سے حجابات کا پیدا ہونا، توجہ کی مشقوں اور صلاحیت کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی روش وغیرہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جوصوفی کو گرانے کا باعث بن جاتی ہیں۔

(۲)

اس دور میں تصوف کے نام پر جو روش عام ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم جیسے خام صوفیاء کی طرف سے طالبوں کو راہ سلوک میں سرسری طور پر چلاکر انہیں خلافت عطا فرماکر معاشرہ میں پیری مریدی کوفروغ دینے کے کام پر لگادیا جاتا ہے۔ یہ کام اخلاص نیت سے ہو یا دکانداری میں اضافہ اس کا مقصد ہو، دونوں صورتوں میں یہ روش انتہائی ضرر رساں ہے۔ اس کا ایک بڑا نقصان تو یہ ہورہا ہے کہ بزرگی کی مسند پر فائز ہم جیسے افراد ہر وقت نفسی قوتوں کے زیر اثر زیر وزبر رہتے ہیں اور حب جاہ، حب مال اور حرص وہوس کے طوفانوں میں رہتے ہیں۔ اس طرح کے افراد ہی ہیں، جنہیں الہام، کشف، مشاہدات، اچھل کود، توجہ وتسخیری وظیفوں کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ تصوف کے نام پر اپنی روزی اور کاروبار کے فروغ پذیری کی صورت پیدا ہوسکے۔

تصوف جیسے ملت کے پاکیزہ ادارہ کے ساتھ ہماری یہ روش نہایت ناانصافی ہے۔ اس سے معاشرہ، مادہ پرستی کی قوتوں کی مزید نظر ہوجانے کے خطرہ ہی سے دوچار ہوسکتا ہے، اس روش کا کوئی افادی پہلونہیں ہے۔

تصوف کی وہ شخصیتیں جو فنا فی اللہ کی صاحب ہیں، جن سے معاشرہ کوحقیقی فیض حاصل ہوسکتا ہے، المیہ یہ ہے کہ ان شخصیتوں کی شہرت سے دوری اور فنائیت کی اداؤں کی وجہ سے معاشرہ کو نہ تو ان کی طلب ہے اور نہ ہی ان سے بڑے پیمانہ پر استفادہ کی صورت پیدا ہورہی ہے، اس طرح معاشرہ، حقیقی اہل تصوف سے محرومی کی وجہ سے تیزی سے اخلاقی وروحانی مفاسد کا شکار ہورہا ہے اور مادہ پرستی، حرص وہوس اور مفادات کی بڑھتی ہوئی آگ ہے، جس نے گھروں اور خاندانوں کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جعلی تصوف نے اس آگ کو بجھانے کی بجائے اس میں مزید تیزی پیدا کردی ہے، اس لئے کہ نفسی قوتوں کو آتش عشق میں جلائے بغیر بزرگی کے منصب پر فائز افراد سے حب جاہ وحب مال پر مشتمل کردار کے علاوہ دوسری کیا توقع کیا جاسکتی ہے۔

(۳)

اکابر بزرگوں نے نفس کو پامال کرکے انہیں اللہ ورسول کے مطیع کرنے اور افراد معاشرہ کو اپنے فیوض سے بہرہ ور کرنے کے لئے جو مجاہدات کئے تھے، وہ غیرمعمولی مجاہدے تھے، کتابوں میں ان کے غیرمعمولی مجاہدے پڑھکر حیرت ہوتی ہے۔ بعض بزرگوں نے چالیس چالیس سال تک شب وروز مجاہدے کئے، ورنہ بیس پچیس سال کے مجاہدے تو بزرگوں میں عام تھے۔ یعنی بیس پچیس سال تک شب وروز آتش عشق میں جلتے رہنے کے مجاہدے۔ ان کے ان مجاہدوں کا اثر تھا کہ معاشرہ کو ہر دور میں ایسے اہل اللہ دستیاب ہوتے تھے، جو سیرت وکردار کی پاکیزگی اور کثرت ذکر کے نور اور اپنے فیوض وبرکات سے افراد میں نئی حقیقی ومعنوی زندگی پیدا کرنے اور ان کے دلوں کو مادی دنیا سے سرد بنانے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

اگرچہ اب بھی معاشرہ میں اس طرح کے فقیر منش اہل اللہ موجود ہیں۔ لیکن ہم جیسے صوفیاء خام نے معاشرہ میں حقیقی تصوف کے نام پر جس تصوف کو متعارف کرایا ہے، وہ کشف، الہام، اچھل کود، کرنٹ کے مظاہر، نظروں سے مسحور ہوجانے اور وقتی وہنگامی کیفیات کے سحر میں رہنے پر مشتمل تصوف ہے۔ سیرت وکردار میں پاکیزگی، معاملات میں بہتری، اپنوں وغیروں سے محبت، دنیا ومالداروں سے استغنا، دینی حمیت، ناجائز مال سے نفرت، سادہ زندگی، اپنے دائراتی خالوں سے بلندی، سمندر میں جزیروں کی طرح رہنے کی بجائے لوگوں سے والہانہ محبت کا ماحول پیدا کرنے وغیرہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جنہیں بدقسمتی سے اس دور میں سرے سے تصوف سے ہی خارج کردیا گیا ہے۔ اب چند ظاہری

مراسم اور کچھ کیفیات کا نام ہی تصوف بن گیا ہے۔ کردار واہل تصوف، زہد وفقر واہل تصوف، یہ چیزیں ایک جگہ جمع ہونا دشوار ہوگئی ہیں۔

ہم جیسے صوفیاء خام نے اپنے تئیں بڑے خوبصورت انداز سے تصوف کا یہ حشر کرکے، نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ افراد معاشرہ کے ساتھ بھی ظلم کیا ہے۔ اور امت کے اس عظیم ادارہ کے تسلسل پر کاری ضرب لگائی ہے۔

ان حالات کی وجہ سے ہی ذہین وباصلاحیت افراد جب اہل تصوف کی طرف رجوع ہوتے ہیں، جب وہ اندر آکر اہل تصوف میں حب جاہ وحب مال کا منظر دیکھتے ہیں اور دولت کی بنا پر آپس کی رسہ کشی اور تصادم دیکھتے ہیں تو وہ سرے سے تصوف ہی سے باغی ہوجاتے ہیں۔ اس وقت ملک کی سیکڑوں درگاہوں وخانقاہوں کا دورہ کیا جائے اور اکابر بزرگوں کی اولاد کا قریب سے مشاہدہ کیا جائے تو اکثر درگاہوں میں بزرگوں کی اولاد کے یہی حالات نظر آتے ہیں۔ بظاہر مریدوں کو فیض دیا جارہا ہے، لیکن داخلی طور پر دولت وجائداد کی تقسیم پر بھائیوں وقریبی عزیزوں کے درمیاں ٹکراؤ جاری ہے اور مقدمات چل رہے ہیں۔

تصوف واہل تصوف اور درگاہوں اور روایتی خانقاہوں کی یہ حالت ایسی ہے، جسے دیکھکر دل کرب واذیت سے سرشار ہوجاتا ہے۔

الحاصل یہ کہ اس دور میں مادہ پرستی کے ہولناک مناظر کی وجہ سے نفس پرستی کی قوتیں بہت زیادہ طاقتور ہوگئی ہیں۔ اس طرح کے حالات میں دوسروں کی فکر سے زیادہ اپنی کھال بچانے کی فکر کا ہونا ضروری ہے۔ البتہ فنا کے حقیقی مقام سے گذر کر، بقا باللہ کی حامل شخصیتیں ایسی ہیں، جنہیں ہم جیسے افراد کو سنبھالنے کی فکر کا ہونا ضروری ہے، ایسی شخصیتوں کے فیوض وبرکات وتوجہات سے ہی ہماری اصلاح کی کچھ نہ کچھ صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

عہد جدید میں ہم جیسے صوفیاء خام میں موجود مذکورہ حجابات بہت گہری صورت اختیار کرچکے ہیں، ان کی نشاندہی کرکے، خود احتسابی کی ضرورت پر زور دینا، وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے، یہ کام نہ ہونے کی وجہ سے معاشرہ کے ہر سطح کے علمی حلقوں میں تصوف واہل تصوف بہت زیادہ متنازعہ ہوگئے ہیں۔ ان سطور میں کسی حد تک یہی کوشش کی گئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عاجز کی اپنی اصلاح کی صورت پیدا فرمائے۔

(۴)

مجھ جیسے صوفیٔ خام کے حجابوں میں سے ایک حجاب یہ ہے کہ دوران سلوک جب نفس کی اصلاح کا عمل جاری ہوتا ہے، تو نفس کی طرف سے شدت سے یہ جذبات ابھرنے لگتے ہیں کہ اب ذکر وفکر کے مجاہدوں اور اصلاح نفس کے معاملہ میں تم بہت آگے جا چکے ہو، اب تمہیں بزرگی کی مسند پر فائز ہوکر دوسروں کی تربیت کا کام ہاتھ میں لینا چاہئے۔

اندر سے یہ جذبات اس شدت سے ابھرنے لگتے ہیں کہ بہت سارے صوفی ان جذبات سے بے قابو ہوکر بزرگی کی راہ پر گامزن ہونے لگتے ہیں۔

اس طرح کے خام صوفیوں کو اگر ایسا بزرگ دستیاب ہو، جو یا تو خود فنا فی اللہ سے بقاباللہ کے مراحل طے کرنے میں ناکام ہوتا، یا اس بزرگ پر معاشرہ میں دعوتی کام کرنے کا میلان غالب ہوتا ہے تو وہ اس دعوتی غلبہ، حسن ظن اور طالب کے ذاتی تقاضہ کو پیش نظر رکھکر اسے مسند خلافت پر فائز کردیتا ہے۔ اگر اس طرح کے صوفیٔ خام کو دوسری دنیا کے مشاہدات اور کچھ مشاہدات بھی ہونے لگے تو اس طرح کی صورت میں تو وہ اپنی بزرگی کو یقینی سمجھنے لگتا ہے۔

اس طرح وہ نفسی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کے مراحل طے کرکے، نفس کو بڑی حد تک مہذب بنانے سے پہلے ہی بزرگ بن جاتا ہے اور یہ بزرگی اس کے لئے زندگی بھر آزمائش بن جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی فکر، دولت کے حصول کی فکر، دوسرے بزرگوں کے مریدوں کو توڑ کر، اپنے حلقہ میں شامل کرنے کی فکر، اپنے کشف اور مشاہدات کے واقعات کو عام کرنے کی فکر، شہرت کی فکر مجلس میں دوسرے بزرگوں کا ذکر ہوتے ہی دل میں جلن کا پیدا ہونا، غرض کہ خام صوفی، نفس کے خلاف طویل عرصہ تک معرکہ آرائی میں ناکامی اور قبل از وقت بزرگ بننے کی نفسی خواہش کی وجہ سے شدید ابتلاء وآزمائش میں مبتلا ہوجاتا ہے، اگرچہ اس کی خواہشات کی تکمیل کے سارے انتظامات ہوجاتے ہیں، لیکن وہ سلف کے متعین کردہ خطوط واصولوں کی خلاف ورزی اور تہذیب نفس وتزکیہ نفس کے عمل میں ناکامی کی وجہ سے محبوب کے عتاب کا شکار ہوجاتا ہے۔

خام صوفی کے اس طرح کے حجاب کو ایک واقعہ سے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں، ہمارے شیخ جو اپنے وقت کے مثالی بزرگ تھے اور جو فنائیت اور اپنے آپ کو مٹانے کی اداؤں میں تو اس دور کے بزرگوں میں یکتا تھے، ان کے ایک مرید لگ بھگ پندرہ سال تک ذکر وفکر مجاہدے کرتے رہے اور مسلسل صحبت میں بھی آتے رہے، پندرہ سال کے بعد نفس نے اس کو اکسایا کہ ان غیر معمولی مجاہدوں کے بعد اب اسے دوسروں کی تربیت کا کام ہاتھ میں لینا چاہئے، چنانچہ اس نے متعدد افراد کو ذکر دینا شروع کیا اور دو چار افراد کا ذکر شروع بھی ہوگیا، اس کے بعد نفس نے اسے یہ بات سجھائی کہ جن افراد کا ذکر چل رہا ہے، وہ مالی اعتبار سے خوشحال بھی ہیں، ان سے مفادات وابستہ کرکے ان سے رقم طلب کی جائے، اگرچہ اس نے ایسا کیا نہیں، لیکن اس سلسلہ میں اس کے نفس میں ہلچل برپا ہونا شروع ہوئی، اسی دوران وہ مرید صاحب اپنے شیخ کے ہفتہ وار حلقہ میں شریک ہوئے تو محترم شیخ صاحب نے خلاف معمول لاؤڈ اسپیکر کا رخ اپنی طرف کرکے فرمایا کہ میں نے تو کسی کو دوسروں کو ذکر دینے کی اجازت نہیں دی، یہ الفاظ سنتے ہی مرید صاحب ہوش میں آگئے، اس طرح وہ قبل از وقت بزرگ بننے کے فتنے سے بچ گئے۔

اس واقعہ میں مجھ جیسے خام صوفی کے لئے متعدد اسباق موجود ہیں۔ ایک سبق تو یہ ہے کہ مادہ پرستی کے موجودہ طوفان خیز موجوں کے دور میں پندرہ سال کے شب وروز کے مجاہدوں اور بزرگ کی طویل عرصہ کی صحبت کے باوجود نفس کے سانپ میں زہر موجود ہوتا ہے، اور اس کی مچلنے اور مکر وفریب کی اس کی ادائیں موجود ہوتی ہیں۔

اس واقعہ میں دوسرا سبق جو موجود ہے، وہ یہ ہے کہ فرد کو سرے سے بزرگ بننے کے جذبات کو پالنے وابھارنے سے ہر ممکن حد تک بچے رہنا چاہئے۔

اس واقعہ میں تیسرا سبق جو پوشیدہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس دور میں بزرگوں کی طویل عرصہ کی صحبت اور غیر معمولی مجاہدوں کے بغیر سرسری طور پر سلوک طے کرکے خلافتیں عطا فرمانا، طالبوں کو شدید ابتلا وآزمائش میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔

(۵)

یہاں اس سلسلہ میں بھی دو واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

حضرت فرید الدین شکر گنج کی ملفوظات کی کتاب ''اسرار الاولیاء'' ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں:

''شیخ شہاب الدین رحمتہ اللہ علیہ کے فرزند نے باپ سے خرقہ کا سوال کیا تو فرمایا ''کل آنا، تمہیں خرقہ دیا جائے گا۔ اسی رات فرزند نے خواب میں دیکھا کہ دو آدمیوں کو فرشتے گلے میں آگ کی زنجیریں ڈالے اوپر کی طرف لے جارہے ہیں۔ آپ نے فرشتوں کا دامن پکڑ کر پوچھا، یہ کون ہیں؟ کہا، یہ پیر ہے اور وہ مرید۔ اس پیر نے اس مرید کو خرقہ دیا تھا، لیکن اس نے اس کا حق ادا نہیں کیا، بلکہ گلی کوچوں اور بازاروں میں پھرتا تھا اور بادشاہوں اور امراء کی صحبت میں رہتا تھا۔ ہمیں حکم ہوا کہ اس تاریک ضمیر پیر اور اس گمراہ مرید کو آگ کی زنجیروں میں جکڑ لو اور دوزخ میں لے جاؤ۔ خواب سے بیدار ہوئے تو شیخ صاحب کے پاس آئے۔ شیخ صاحب صاحب نے مسکرا کر پوچھا کہ خرقہ پوشوں کا حال دیکھ لیا ہے کیا؟ فرمایا، اے فرزند! خرقہ وہ شخص پہنتا ہے، جو دونوں جہانوں سے قطع تعلق کرے اور اپنے پیروں اور مشائخ کے طریقہ پر کاربند رہے۔ تو ابھی ستر پردوں میں بند ہے، خرقہ پہننے کا وقت ابھی تیرے لئے نہیں آیا۔ واپس چلا جا، ورنہ تیری بھی وہی حالت ہوگی، جو خواب میں اس پیر اور مرید کی دیکھی۔ فرمایا کہ جب تک انسان اپنے آپ کو دنیاوی آلائشوں سے صاف نہ کرے، اسے خرقہ نہیں پہننا چاہیے اور نہ ہی پیر کو چاہیے کہ بغیر صاف کئے اسے خرقہ دے، کیونکہ خرقہ انبیاء واولیاء کا لباس ہے۔ جو شخص دنیاوی آلائشوں میں ملوث ہوگا، وہ خرقے کا حق ادا نہیں کر سکے گا او جب حق ادا نہیں کر سکے گا تو گمراہی میں پڑے گا۔ (واضح ہو کہ خرقہ اس زمانہ میں بزرگی، درویشی اور خلیفہ ہونے کی علامت ہوتا تھا۔ مرتب)

فرمایا، اے درویش! خرقہ پہن لینا تو آسان ہے، لیکن اس کی حق ادائی مشکل کام ہے۔ اگر صرف خرقہ پہن لینے سے نجات حاصل ہوتی تو سارے خرقہ پہن لیتے۔ خرقہ پہن کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر تو نے خرقہ پوشوں جیسے اعمال کئے تو بہتر، ورنہ یہی خرقہ قیامت کے دن مدعی بن کر پوچھے گا کہ تو نے مجھے پہنا تو ضرور، لیکن میری حق ادائی کیوں نہ کی۔ اس وقت فرشتوں کو حکم ہوگا کہ تیرے گلے میں آگ کا خرقہ پہنائیں اور دوزخ میں لے جائیں۔ فرمایا کہ اگر تو خرقہ پہننا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر پہن، نہ کہ

خلقت کے دکھانے کیلئے، تاکہ وہ تیری عزت کریں۔ اگر تو ایسا کرے گا تو قیامت کے دن بے بس اور مجبور ہوجائے گا اور گرفتار کیا جائے گا۔ فرمایا کہ اس راہ میں پیر میں ذاتی قوت ہونی چاہیے، تاکہ اگر کوئی مرید ہونے کی خاطر حاضر خدمت ہو تو نور معرفت سے اس کے قلوب ثلاثہ کو دیکھے اور دنیاوی کدورت، کینہ، کھوٹا پن سے صاف کرکے کچھ مدت اپنے پاس رکھ کر، مجاہدہ کا حکم کرے۔ بعد ازاں جب اس میں حرص وہوا کی کوئی کدورت باقی نہ رہ جائے تو پھر اگر خرقہ دے تو جائز ہے، لیکن اگر پیر میں اس قسم کی قوت نہ ہو اور کسی کو خرقہ وکلاہ دے دے گا تو خود بھی گمراہی میں پڑے گا اور اسے بھی گمراہی میں ڈالے گا۔ (صفحہ۵۸)

آپ ایک جگہ اور ملفوظ میں فرماتے ہیں:

میں ایک بزرگ کی خانقاہ میں گیا، اس نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا، فقیر بیٹھ جایئے، میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک صاحب آئے، اس نے بزرگ سے کہا کہ آپ کے فلاں خلیفہ صاحب کو میں نے مالداروں کے ہاں دیکھا ہے، یہ سن کر آپ سخت نالاں ہوئے اور حکم دیا کہ اسے تلاش کرکے میرے پاس لاؤ، مرید اسے تلاش کرکے بزرگ کے پاس لائے، بزرگ نے اسے دیکھتے ہی حکم دیا کہ اس کا خرقہ اتار کر آگ میں جلاؤ، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اس کے بعد بزرگ نے اسے حکم دیا کہ تم نے مجھے سخت اذیت پہنچائی ہے، آئندہ میری مجلس کا رخ ہرگز نہ کرنا۔ (ایضا)

حضرت غلام علی شاہ اپنی ملفوظات کی کتاب جس کا ترجمہ محمد نذیر رانجھا صاحب نے کیا ہے، لکھتے ہیں: بزرگوں کے ہاں یہ روایت تھی کہ دس سال کے مجاہدوں سے پہلے انہیں سلوک طے کرا کر خلافت کے منصب پر فائز نہیں کیا جاتا تھا، ایک بزرگ نے اس اصول کی خلاف ورزی کرکے کچھ مریدوں کو دس سال سے پہلے ہی خلافت کی مسند عطا کردی، انہی دنوں اس علاقہ میں ایک بڑا فتنہ پیدا ہوا، بزرگ کے یہ خلافت یافتہ افراد اس فتنہ کی نذر ہوگئے، اس طرح وہ نفس پرستی کی دلدل میں مبتلا ہوگئے۔''

(۶)

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اس دور میں اہل تصوف کی قابل ذکر تعداد میں جو نقص یا حجاب پیدا ہوگیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام اور اکابر بزرگان دین کے مزاج اور ان کے طرز زندگی سے عدم مناسبت پیدا ہوگئی ہے، اسلاف کی زندگی زہد، فقر اور اور مظاہر دنیا سے بے نیازی وپاکیزگی کا نمونہ تھی، اسلاف شہرت ونام ونمود سے دور تھے۔ اسلام میں ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدے تھے، اسلاف میں معاصر بزرگوں سے والہانہ محبت کے تعلقات قائم تھے، اسلاف خلافت کو بہت بڑی امانت سمجھتے تھے، اس لئے وہ اس امانت کو فنا کے سارے مقامات طے کرکے حالت بقا میں آنے والے افراد کو اسے عام تقسیم نہیں کرتے تھے، اسلاف کا سارا دعوتی کام اللہ کی ذات سے توکل پر تھا، وہ مالداروں سے دور رہتے تھے وہ وقت کے بادشاہوں کی کوششوں کے باوجود ان کے ہدایا قبول نہیں کرتے تھے۔

سلف کے اس مزاج اور مظاہر وطرز زندگی سے عدم مناسبت وعدم مطابقت کی وجہ سے تصوف نے اب رخ اختیار کیا ہے اس میں دنیا بھرپور آمیزش شامل ہوگئی ہے۔ اور معاشرہ کو بدلنے اور مادیت کی طوفانی لہروں کی روک تھام کے سلسلہ میں اس کا کردار بہت محدود ہوگیا ہے۔

آخر میں اپنے ایک نوجوان بزرگ دوست (جسے متعدد بزرگوں سے خلافت حاصل ہے) ان کے نام لکھے گئے خط کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

ایک قابل رشک داعی وصوفی

تعارفی جائزہ

(۱)

موجودہ دور میں اللہ کے ایسے دوست بھی موجود ہیں، جن کی زندگی سلف کا نمونہ ہے اور جو اکابر بزرگان دین کے نقوش وخطوط پر مستقل مزاجی سے کام کر رہے ہیں۔ اس طرح کی شخصیتوں کو دیکھکر ہی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت تک ایسے داعی ومزکی پیدا کرتا رہے گا، جو دنیا سے دستبردار ہو کر، اللہ کی رضا کی خاطر لوگوں کی تربیت وتزکیہ اور اصلاح کے لئے اپنی توانائیاں صرف کریں گے اور دعوت اسلامی کے کام کے فروغ کے لئے غیر معمولی مجاہدوں سے کام لیں گے۔

اس دور میں اس سلسلہ میں ہمارے نقشبندی سلسلہ کی بہترین مثال حضرت مولانا محمد شاہ قریشی مدظلہ کی ہے۔

موصوف حضرت فضل علی قریشیؒ کے خاندان کے فرد ہیں، لگتا ہے کہ وہ حضرت فضل علی قریشیؒ کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں، حضرت فضل علی قریشیؒ کی زندگی، اکابر بزرگان دین کا مثالی نمونہ تھی، وہ زرعی زمین میں خود ہل چلا کر، اناج بوتے تھے اور اسی اناج سے اپنی مسکین پور کی خانقاہ میں آنے والے اللہ کے طالبوں کے لنگر کا انتظام ہوتا تھا، وہ جھونپڑی نما کچے مکان میں رہتے تھے، دعوتی سفر میں ہوتے تھے تو اکثر وبیشتر اپنے ساتھ میٹھی روٹی (جسے ہم سندھی زبان میں روٹ کہتے ہیں) لے جاتے تھے (اس روٹ کے خاصیت یہ ہے کہ یہ مہینوں تک خراب نہیں ہوتی) سفر میں عام طور پر موصوف اسی روٹی پر گزارہ کرتے تھے۔ چونکہ صاحب کشف تھے، اس لئے دوسروں کے ہاں کھانے میں صفائی وپاکیزگی کی معمولی کمی یا معمولی کثافت بھی موجود ہوتی تھی تو دل پر غبار پیدا ہوجاتا تھا، اس لئے وہ ذکر کے انوار کو پوری طرح برقرار رکھنے کے لئے کھانے میں اس طرح کی احتیاط کو ناگزیر سمجھتے تھے۔

مسکین پور چند کچے گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اِس وقت بھی مسکین پور کے مکانات کی سادگی دیکھکر، اس دور کی سادگی کا حیرت انگیز منظر سامنے آتا ہے، حضرت مولانا محمد شاہ قریشی مدظلہ حضرت فضل علی قریشی ہی کا تسلسل ہیں۔

ان کی صفات، خوبیوں اور دعوتی کام کے لئے جذبہ وتحرک کو دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ موصوف اس وقت نقشبندی سلسلہ کی سب سے بڑی بزرگ اور روحانی شخصیت ہیں، ان میں زہد وفقر کے اجزاء پوری طرح موجود ہیں۔ سادہ مکان میں رہتے ہیں۔ شان وشوکت سے دور ہیں، ان کا دروازہ طالبوں اور ملنے والوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ اپنے طالبوں اور علمی مزاج کے حامل افراد کے ساتھ وہ گھنٹوں نشست کرتے ہیں اور اپنی گفتگو اور روحانیت سے انہیں گرمانے کا موجب بنتے ہیں۔ موصوف ہر ماہ کے ۲۸ دن دوروں میں رہتے ہیں، ان دوروں میں صبح سے مصروفیات اور پروگرام شروع ہوتے ہیں تو رات گئے تک جاری رہتے ہیں۔ ان کی نیند دوچار گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتی، ان کا کھانا سادہ اور برائے نام ہوتا ہے اور اسی سے ان کی غذائی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ مسلسل دوروں، نیند اور غذائیت کی کمی کی وجہ سے اگرچہ وہ عمر رسیدہ نظر آتے ہیں، لیکن ان کی عمر ۵۵ سال سے زیادہ نہیں۔ تاہم ان کی جسمانی صحت بظاہر بہتر نظر آتی ہے۔

پاکستان کا کوئی قابل ذکر قصبہ ایسا نہیں ہے، جہاں موصوف نہ گئے ہوں، ایک ایک دن میں ان کی تین تین چار چار تقاریر ہوتی ہیں، اللہ نے ان کو ہمت وحوصلہ سے نوازا ہے کہ وہ خوش اسلوبی سے یہ سارے کام سرانجام دیتے ہیں۔

ان کی گفتگو اور تقریر میں تاثیری صلاحیت موجود ہے، ان سے اصلاح کے سلسلہ میں بے شمار افراد وابستہ ہیں، اس طرح ان کی دعوتی سرگرمیوں سے معاشرہ میں اسلام کے روحانیت کے پیغام رسانی کا کام بہتر اور مؤثر طور پر ہو رہا ہے۔

ان کی شخصیت کی دوچار خوبیاں ایسی ہیں، جن سے یہ عاجز بالخصوص متاثر ہوا ہے، ایک یہ کہ وہ فقر وفقر کی زندگی پر قائم ہیں، بڑی گاڑی، بڑا بنگلہ، اور جائداد واملاک بنانے کی فکر سے آزاد ہیں، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو وہ بعض دوسرے بزرگوں کی طرح ایسا کر سکتے ہیں۔ اپنے مریدوں کے ذریعہ وہ کروڑ پتی بن سکتے ہیں اور جدید دور کے مشہور بزرگوں کی طرح شاہانہ زندگی گزار سکتے ہیں، لیکن لگتا ہے کہ بزرگوں کی دعاؤں اور ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں نے دنیا کے حوالے سے ان کی آرزوؤں کو پامال اور سرد کر دیا ہے اور دولت کے مضمرات سے پوری طرح آگاہی کی وجہ سے وہ شعوری طور پر بھی اکابر بزرگان دین کی فقر کی راہ کو ناگزیر سمجھتے ہیں اور موصوف اس سے انحراف کے نتائج سے پوری طرح آشنا ہیں۔

ہماری نظر میں اس دور میں فقر کا مفہوم یہ ہوگا کہ بزرگ، سرمایہ داروں اور مالداروں کی طرح شاہانہ زندگی سے احتراز کرے اور مال بنانے کی فکر سے محفوظ ہو، باقی نئے دور کی ضروری ایجادات اور سہولتوں سے استفادہ کرنا، فقر کے منافی شمار نہیں ہوگا، مناسب گاڑی، بہتر مکان (اگر وسائل موجود ہوں تو) یہ چیزیں تو اس دور میں ضروریات میں شامل ہوگئی ہیں، لیکن معیار زندگی کی ڈور میں شریک ہونے اور سرمایہ داروں سے مشابہت پیدا کرنے سے بچنا ضروری ہے۔ یہ چیز ایسی ہے، جو بزرگ کے مزاج میں تغیر پیدا کا موجب بن جاتی ہے اور اکثر یہی دیکھا گیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب فقر کی اس نوعیت کا پورا ادراک رکھتے ہیں اور اس کا خصوصی اہتمام فرماتے ہیں کہ اپنی طرز معاشرت میں تغیر برپا نہ ہو۔

ان کی دوسری ادا جس نے اس عاجز کو بہت زیادہ متاثر کیا، وہ اللہ کے بندوں کی آخرت بنانے کے لئے اپنے آپ کو ہر وقت متحرک رکھنا ہے اور ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلسل دورے کرکے، اصلاح وتربیت وتزکیہ کے کام کو جاری رکھنے اور اپنے ساتھ وابستہ افراد کو روحانی اعتبار سے مستحکم کرنے کی ادا ہے۔

دعوتی کام کے لئے اس طرح کی فنائیت اور اپنی ساری توانائیوں وصلاحیتوں اور جسمانی صلاحیتوں کے آخری حد تک استعمال کی ہمارے ہاں اس طرح کی دوسری مثال اس وقت نظر نہیں آتی۔

ان کی تیسری نمایاں خوبی (جس کا اس وقت اہل تصوف کے ہاں فقداں ہے) وہ طالبوں اور ہر طرح کے افراد کو آسانی سے میسر ہونا ہے اور اپنی اداؤں کے ذریعہ یہ تاثر دینا ہے کہ وہ انہی میں سے ہے، ان سے مختلف نہیں۔

ملک بھر سے مسکین پور جو طالب ان کے ہاں آتے ہیں، وہ ان کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں، اور انہیں اتنا وقت دیتے ہیں کہ ان کے سفر کی ساری تھکاوٹ دور ہوجاتی ہے۔

حضرت مولانا محمد شاہ قریشی مدظلہ کے ہاں ہر سال سالانہ دوروزہ پروگرام بھی ہوتا ہے، اس سال اس روحانی پروگرام میں لگ بھگ دو لاکھ افراد شریک ہوئے۔

ہمیں کبھی کبھار خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں مریدوں کی کثرت کی وجہ سے حضرت مولانا سے قریبی ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع نہ ہوجائے اور وہ حفاظتی پہروں میں رہنے پر مجبور نہ ہوجائیں یا دولت آجانے کی وجہ سے ان کی شخصیت میں مالداری کے رنگ وروپ شامل نہ ہوجائیں، لیکن الحمدللہ ان کی تربیت اس مستحکم بنیادوں پر ہوئی ہے کہ وہ مسلسل خود احتسابی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو ان خطرات سے بچانے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔

قارئین کے لئے یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہوگی کہ موصوف کے ساتھ دور دراز کے دوروں میں کوئی خادم ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ دورہ میں تنہا ہوتے ہیں۔ اپنی خدمت خود ہی کررہے ہوتے ہیں۔ لمبا سفر ریل گاڑی میں ہوتا ہے، مختصر سفر کے لئے گاڑی کا استعمال ہوتا ہے۔

حضرت مولانا اپنی تقاریر میں ذکر پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ زندگی ذکر سے ہی قائم ہے۔ نیز ذکر کا کوئی بدل ہی نہیں ہے۔

شاہ صاحب کے مزاج کی یہ خاصیت بھی قابل رشک ہے کہ وہ ہر مکتبہ فکر کی مذہبی شخصیتوں سے مراسم رکھتے ہیں، اس اعتبار سے وہ کھلے ذہن کے حامل ہیں اور اپنے دائرہ میں بند ہونے والے صوفیوں سے بالکل مختلف صوفی ہیں، ملک بھر کے دوروں وسفر کے دوران مختلف مزاج کے حامل عالموں وبزرگوں اور ہر طرح کی شخصیتوں سے روابط وملاقاتوں کی وجہ سے افراد کے بارے میں موصوف کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور اس سلسلہ میں وہ کافی معلومات رکھتے ہیں۔

(۲)

ہم اپنے معاشرہ کے بڑھتے ہوئے اخلاقی زوال کا جتنا بھی جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارا زوال اور یہ ساری اخلاقی خرابیاں معاشرہ میں تزکیہ اور پاکیزہ اخلاقی نصب العین کے کام کے لئے ہمہ جہتی تحریک کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے، ہمارے اہل سیاست ہوں یا اہل تجارت یا اہل مذہب اور اہل جہاد، ان سب کی بڑی اکثریت تزکیہ کے کام کی اہمیت اور نفسی قوتوں کی ہولناکی سے ناآشنائی کی وجہ سے بڑی طرح اس کی زد میں ہے۔ اس حد تک کہ جہاد کے نام پر ریاست وریاستی اداروں کے خلاف ہتھیار اٹھا کر، بھارت اور مغربی ملکوں سے پیسے لینے کے پس پردہ بھی نفسی قوتیں اور نفسی جذبات ہی شامل ہیں، جس کے انکشافات اب قوم کے سامنے جہادی تحریکوں کے علمبرداروں کی طرف سے آرہے ہیں، تزکیہ، اصلاح نفس اور پاکیزہ اخلاقی نصب العین کے لئے معاشرہ میں ہلچل برپا کرنا، وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اس کے بغیر معاشرہ کو ہمہ گیر فساد اور تلپٹ ہونے سے بچانا ناممکنات میں شامل ہیں۔

اس اعتبار سے قومی سطح پر حضرت شاہ محمد قریشی مدظلہ کا کام ایسا ہے، جو ملت کی بقا کا کام ہے اور ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا کام ہے، اگرچہ ملک کے مختلف شہروں وقصبوں میں

دوسرے بزرگ بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، لیکن قومی سطح پر بڑے پیمانہ پر اس کام کا سہرا حضرت شاہ صاحب ہی کو جاتا ہے اور یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے آں موصوف ہی کو عطا کی ہے، پبلسٹی، شہرت، اور وسائل سے بے نیاز ہو کر فقر، توکل اور استغنا کے ساتھ یہ کام کرنا اور اس میں اپنی ساری صلاحیتوں وتوانائیوں کو خرچ کرنا۔ ایں سعادت زور بازو نیست۔

(۳)

شاہ صاحب کی جدوجہد سے سرشار اور پُر مشقت زندگی ایسی ہے، جس میں کوئی فرد ان کا ساتھ دینے کی سکت نہیں رکھتا، اس لئے وہ اپنے دوروں میں کسی معاون یا خادم کو زحمت نہیں دیتے۔ محترم شفیع الدین صاحب جو ان کے مخلص مرید ہیں، وہ دعوتی دوروں میں دو دن ان کے ہمراہ رہے، دو دن تک مسلسل سفر، لگاتار بعد دورے اور پروگراموں میں شرکت اور نیند کی کمی کی وجہ سے وہ بیمار ہوگئے۔ ان کے دوسرے مخلص مرید مفتی محمد رئیس صاحب کچھ دن سفر میں ہمراہ رہے اور ان کی تقاریر کی ترتیب وتدوین کا کام بھی کرتے رہے، وہ سخت ذہنی تھکاوٹ کا شکار ہو کر بستر پر پڑے رہے۔

حضرت شاہ صاحب کے محبین اس بات پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ پندرہ بیس سال سے شب وروز کی اس طرح کی پُر مشقت دعوتی سرگرمیاں کہیں ہمیں شاہ صاحب کی صحبت سے محروم نہ کردیں، اس لئے کہ روحانی قوت اور روح ایک حد تک تو مادی جسمانی نظام کو اپنے ساتھ چلا سکتا ہے، لیکن اس طرح کی مسلسل جدوجہد اور بے آرامی سے بالآخر اعصابی نظام معطل ہونے لگتا ہے، اور فرد کے لئے دوبارہ سنبھل کر معمولی کام سرانجام دینا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کو اپنے محبین کی اس تشویش کے پیش نظر اپنی تیز رفتار دعوتی سرگرمیوں اور دوروں میں کمی کرنے اور ان میں اعتدال لانے کی درخواست کرنا ضروری ہے۔

(۴)

حضرت شاہ محمد شاہ قریشی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو ہم جیسے مدعیان تصوف کے لئے قابل تقلید بھی ہے تو اتمام حجت بھی۔

ان کا فقر اور دنیا سے استغنا ہو یا اپنوں اور غیروں سب کے لئے ہر وقت اپنے دروازوں کا کھلے رکھنے کا عمل ہو، اپنے مکتبہ فکر سے باہر کے علماء وصلحاء اور مذہبی شخصیتوں سے تعلقات وروابط رکھنے کا عمل ہو یا اپنی ساری توانائیوں کو دعوت دین کے فروغ میں صرف کرنے کی ادا ہو۔ موصوف کی یہ ساری ادائیں ایسی ہیں، جو ہمارے لئے قابل رشک بھی ہیں تو قابل تقلید بھی۔

ان کی زندگی کے اس نمونہ کو دیکھکر، ہم جیسے اہل تصوف کو اللہ کے ہاں عذر پیش کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ مادہ پرستی کی فضا کے غلبہ کی وجہ سے ہمارے لئے زہد، فقر، دنیا اور اہل دنیا سے استغنا کی صورت عملاً ممکن نہیں تھی۔ یا مریدوں کی کثرت کی وجہ سے حفاظتی پہروں میں رہنا ہماری مجبوری تھی، شاہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے مثالی کردار سے ہمارے لئے اس طرح بہانوں کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں چھوڑی۔

(۵)

انسانی نفسیات کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ مثالی زندہ انسانوں کی قدر کرکے، ان سے بھرپور استفادہ کرنے سے بخل کا مظاہرہ کرتی ہے، اس طرح مثالی شخصیت، ایک اعتبار سے اپنے متوسلین میں حجابات پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے، لیکن جوں ہی وہ شخصیت آنکھیں بند کر لیتی ہے اور دنیا سے رخصت ہوجاتی ہے تو اچانک متوسلین کی آنکھیں کھلنے لگتی ہیں اور وہ رونے لگتے ہیں کہ ہم نے کتنی پاکیزہ شخصیت گنوادی اور ان سے بھرپور استفادہ کرنے اور ان کے فیض سے بہرہ ور ہونے میں کتنی غفلت کا مظاہرہ کیا، اس کی اہم مثال حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خانؒ کی ہے کہ ان کے متوسلین کی اکثریت نے ان کی شخصیت سے بھرپور استفادہ کے سلسلہ میں سستی وغفلت کا مظاہرہ کیا، ان کے وصال کے بعد وہ کف افسوس ملتے رہتے ہیں کہ ہمیں اتنی بڑی شخصیت کی صحبت حاصل رہی، لیکن عملاً ہم ان سے کچھ زیادہ حاصل نہ کر سکے، اب ایسی شخصیت کہاں تلاش کریں۔

دراصل یہ نفس کے پیدا کردہ حجابات ہوتے ہیں، جو وہ زندہ مثالی اور پاکیزہ شخصیتوں کے بارے میں متوسلین کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔

حضرت محمد شاہ قریشی مدظلہ کی شخصیت سے بھرپور استفادہ کے سلسلہ میں ان کے متوسلین کی عمومی حالت اس سے مختلف نہیں۔ ان کی صحبت سے اپنی زندگی کے نقوش وخطوط کو ان سے ہمہ آہنگ کرنے کے لئے کوشاں ہونا، ذکر وفکر میں استغراق کا مظاہرہ کرنا، ان سے فقر کی زندگی سے کچھ اجزاء حاصل کرنا وغیرہ ان سارے معاملات میں سستی وغفلت کا مظاہرہ ہورہا ہے۔

شاہ صاحب کی سرپرستی میں نکلنے والے سہ ماہی رسالہ کے مرتب نے بتایا کہ رسالہ کے لئے وسائل مہیا نہیں ہوتے، شاہ صاحب نے رسالے کے تعاون کے لئے مریدوں اور متوسلین کو توجہ دلانے سے منع کر دیا ہے اور مریدین ازخود تعاون کرتے نہیں، اس لئے ماہانہ رسالہ تو دور کی بات ہے، سہ ماہی چالیس پچاس صفحات کا رسالہ بڑی مشکل سے نکل رہا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فقر کی صاحب اہل دل شخصیتوں کے دعوتی کام کے حوالے سے ان کے متوسلین کی عمومی حالت کیا ہوتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ عطا فرمائے کہ ہم شاہ صاحب جیسی مثالی شخصیتوں سے بھرپور فیض حاصل کرسکیں اور ان کے دعوتی کاموں میں اپنے حصہ کا کچھ نہ کچھ کردار ادا کرسکیں۔

(۶)

اوپر معاشرہ کے بڑھتے ہوئے جس زوال کا ذکر کیا گیا، اس کی روک تھام کے سلسلہ میں اہل تصوف کے کردار پر یہاں حضرت مولانا شاہ صاحب کے حوالے سے کچھ معروضات پیش کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ اہل تصوف اس غور وفکر فرمائیں۔

ہماری نظر میں جدید نظریات وافکار کا ایک سیلاب ہے، جو جدید تعلیمی اداروں اور میڈیا کے ذریعہ نسلوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جارہا ہے۔ جدید افکار ونظریات کی بنیاد خالص مادہ پرستی، سیکولرزم اور محض دنیا کو مقصود بنانے والے افکار پر ہے، ان افکار اور نظریات کے غلبہ نے ہماری جدید پڑھی لکھی آبادی کو بھی ذہنی طور پر مغربی انسان کے ہم آہنگ بنا دیا ہے، اس لئے جدید نسلوں کے ذہنی اشکالات کو سمجھکر، انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا، وقت کی اہم ضرورت ہے، اس کام کو اہمیت نہ دینے کی وجہ سے جدید نسلیں ہمارے ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسرا اہم مسئلہ جدید اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد اور تصوف کے مخالف مذہبی حلقوں کا ہے کہ تصوف کی ان کی مخالفت کا ایک اہم سبب تصوف سے وابستہ افراد کی عمومی ذہنی سطح ہے، جس کے تحت کشف، کرامات، تصرفات اور دوسری دنیا کے مشاہدات ہی کو تصوف کے اہداف سمجھا گیا ہے اور ان کے سامنے زیادہ تر تصوف کی یہی حیثیت اجاگر ہوئی ہے۔

یہ دو رکاوٹیں ایسی ہیں، جن کی وجہ سے موجودہ دور میں جدید علمی حلقوں میں تصوف واہل تصوف سے دوری کی فضا بڑھ گئی ہے، ان حالات میں ہماری نظر میں ضروری ہے کہ اہل تصوف کی طرف سے ایک تو جدید افکار ونظریات کی سنگینی اور اس کی نوعیت کو سمجھکر اس ذہنیت کو مطمئن کرنے کے لئے جدید علمی اسلوب کے حامل افراد پیدا کئے جائیں، اس طرح کے افراد اہل تصوف میں موجود ہیں، لیکن ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرکے، انہیں اس کام پر لگانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ تصوف کو وقت کے دو مجددوں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی تحریروں کی روشنی میں جدید علمی اسلوب میں پیش کرکے تصوف سے وابستہ افراد کی تصوف کے صحیح بنیادی خطوط ونقوش اور اصولوں کے حوالے سے ذہن سازی کی جائے۔ ہمارے ان مجددوں نے تصوف کے جو خطوط واضح فرمائے ہیں، ان میں کشف، کرامات، تصرفات ومشاہدات اور کیفیات وغیرہ کو تصوف کے بنیادی اہداف اور بنیادی اصولوں میں شامل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ان چیزوں کو انعام اور حوصلہ افزائی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ تصوف کے اصل اہداف اصلاح نفس، تزکیہ، ذکر میں استقامت، اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی استعداد اور اخلاقی رزائل کی صفائی وپاکیزگی وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔

تجدید احیائے دین کے ان دو مجددوں کی تعلیمات سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اہل تصوف کی صحیح خطوط پر ذہن سازی کا کام متاثر ہے۔ چنانچہ علمی طور پر تصوف کی صحیح ترجمانی کے فقدان کی وجہ سے تصوف سے دوری اور اس کی مخالفت بڑھتی جارہی ہیں، ان دو کاموں کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ان کاموں کے لئے صرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تصوف میں اس طرح کے باصلاحیت افراد موجود ہیں، جو یہ کام کر سکتے ہیں، لیکن بزرگ اگر اس کام کو ترجیح دے کر، ان کی سرپرستی کریں اور اپنے رسائل میں ان موضوعات پر مؤثر تحریروں کا انتظام فرمائیں تو انشاء اللہ جدید نسلوں اور جدید اسلامی فکر کے حامل افراد کو اہل تصوف کے قریب کرنے میں آسانی پیدا ہوگی۔

یہ معروضات حضرت مولانا محمد شاہ قریشی مدظلہ کے حوالے سے اس لئے پیش کی گئی ہیں کہ موصوف وسعت فکر کے حامل ہیں اور انہیں اسلامی وروحانی اعتبار سے معاشرہ کو سنبھالنے کی ہم سب سے زیادہ فکر دامنگیر ہے۔

تصوف وعملیات کی جدید شخصیت

مختصر تعارف

حکیم محمد طارق محمود چغتائی صاحب کی شخصیت بڑی طلسماتی شخصیت ہے، موصوف ممتاز حکیم ہیں، ایسے حکیم، جن کو نبض دکھانے کے لئے کئی دن پہلے وقت لینا پڑتا ہے، موصوف پیر اور صوفی بھی ہیں، لیکن ایسے پیر، جو مریدوں کو آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے، مرید، ان سے گفتگو کے لئے ترستے رہتے ہیں، موصوف عامل بھی ہیں، بلکہ عملیات کے فن میں وہ یکتائے روزگار ہیں، اس سلسلہ میں موصوف کافی عرصہ سے ''عبقری'' کے نام سے ماہنامہ رسالہ نکال رہے ہیں، جس میں اوراد ووظائف کی مادی نوعیت کی خصوصیات، جنات سے ملاقات ورابطوں کے حالات وواقعات، اپنے وظیفوں کے فوائد وبرکات وثمرات اور اپنے طبی نسخوں کی خصوصیات اور ہر بیماری کی شفایابی کے لئے ان نسخوں کے کیمائے اثر ہونے کی تفصیلات شامل ہوتی ہیں۔

موصوف نے اپنی علمی وفنی صلاحیت اور وظائف پر محنت کی وجہ سے ''عبقری'' رسالہ کو اتنا دلچسپ، سحر انگیز اور معلومات افزا بنا دیا ہے کہ جسمانی وروحانی مسائل کی شکار نئی نسل ''عبقری'' رسالہ کو اپنے لئے عظیم تحفہ شمار کرتی ہے، حکیم صاحب کے ہاں مراقبہ کی نشست بھی ہوتی ہے اور ''مراقبہ کے کرشمات'' کے نام سے ان کی کتاب بھی موجود ہے۔

ان کے ''عبقری'' رسالہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی اشاعت دو لاکھ چالیس ہزار ہے، ان کے فرمان کے مطابق ایک بھی رسالہ اعزازی نہیں جاتا، سارے رسالے قیمتاً نکلتے ہیں، اس طرح محض ''عبقری'' رسالہ کی اشاعت سے ماہانہ لاکھوں روپے کی آمدنی ہوجاتی ہے۔

حضرت حکیم صاحب، صاحب تصنیف وتالیف بھی ہیں، موصوف نے ڈھائی سو کتابیں تالیف کی ہیں، حضرت حکیم صاحب سوشل میڈیا میں ماہر عملیات اور صوفی کی حیثیت سے اس شان سے سامنے آئے ہیں کہ لاکھوں افراد انہیں سننے، انہیں دیکھنے اور ان سے استفادہ کے لئے آمادہ ہیں، حضرت حکیم صاحب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ موصوف ملک بھر کے دورے کرتے ہیں، ہر جگہ مریدوں کو اپنے فیوض سے بہرہ ور کرتے ہیں اور ہر جگہ پیروں وبزرگوں کی مزاروں پر مریدوں کے ساتھ حاضری دیتے ہیں اور حال حیات صوفیاء سے ملاقات کا خصوصی اہتمام فرماتے ہیں۔

حضرت حکیم صاحب کے ان سارے کاموں اور خصوصیات کو دیکھ کر انہیں طلسماتی شخصیت کہنا بجا ہے۔

ممتاز حکیم، ممتاز عامل اور ممتاز صوفی کی حیثیت سے حضرت حکیم صاحب کا کام ایسا ہے، جو قابل تعریف ہے، موصوف پچھلے دنوں حیدرآباد کے دورہ پر تشریف لائے تو اپنے مریدوں کے ہمراہ اس عاجز کے ادارہ میں بھی تشریف لائے، ان کے ساتھ سندھ کے بعض علماء کرام بھی شامل تھے، جو ان سے بیعت وعقیدت کا تعلق رکھتے ہیں، جس سے اندازہ ہوا کہ حکیم صاحب طبقہ علماء کو بھی اپنی سحر انگیز شخصیت سے متاثر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

(۲)

''مراقبہ کے کرشمات'' کے عنوان سے حضرت حکیم صاحب کی کتاب پڑھنے کا شوق تھا، لیکن معلوم ہوا کہ کتاب میں اس موضوع پر حکیم صاحب کی تحقیق یا زندگی کو بدلنے کے سلسلہ میں مراقبہ کے کردار کے حوالے سے حضرت حکیم صاحب کے قیمتی نکات شامل نہیں ہیں، بلکہ ان کے مریدوں اور ان کے حلقہ سے وابستہ افراد کے تاثرات ہیں کہ ہم نے حکیم صاحب سے مراقبہ لے کر شروع کیا تو ہمیں دوسری دنیا کے کیا مشاہدات حاصل ہوئے یا ہم نے کیا محسوس کیا، آج جب کہ مادی مراقبہ کے موضوع پر سوشل میڈیا میں دھوم مچی ہوئی ہے، مغرب میں اس پر بڑی ریسرچ ہورہی ہے، ہندو یوگیوں کی طرف سے مغرب میں مشرکانہ نوعیت کے مراقبہ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں، ایسے حالات حضرت حکیم صاحب

جیسی سوشل میڈیا کی مشہور روحانی شخصیت کی طرف سے اسلامی مراقبہ کے موضوع پر تفصیلی کتاب سامنے آنی چاہئے تھی، مراقبہ پر طالبوں کے تاثرات پر مبنی کتاب اس ضرورت کو پانچ فیصد بھی پورا نہیں کرتی۔

(۳)

''عبقری'' کے تازہ شمارے میں دو اشتہاروں پر نظر پڑی، دل نے چاہا کہ اگر یہ اشتہارات نہ آتے تو حضرت حکیم صاحب کی شخصیت کی توقیر میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ پہلے اشتہار کے الفاظ یہ ہیں:

احمد پور شرقیہ کے لیے ایک انوکھا اعزاز
اسم اعظم کا دم اور اور خاص الخاص تعویذ بالکل فری

''اب دل کی تمنا پوری ہوگی، تاریخ گواہ ہے کہ گزشتہ کئی سالوں سے شیخ الوظائف حضرت حکیم صاحب دامت برکاتہم کا تعویذ دینے کا معمول نہیں ہے، ایک خاص امر کے کے تحت یہ تعویذ بانٹا جارہا ہے۔ حضرت حکیم صاحب دامت وبرکاتہم کا درس اور سپیشل اسم اعظم کا دم ہر شخص کو انفرادی لاہور کی طرز پر ہوگا، اور برکت والا تعویذ شیخ الوظائف دامت برکاتہم اپنے ہاتھوں سے عنایت فرمائیں گے۔ قسمت اور مقدر کے سکندر بنیں، قرآنی آیات سے لکھا اور کفریہ کلمات سے پاک صدیوں سے لکھا، وہ تعویذ جسے اللہ تعالیٰ چند برگزیدہ خاص الخاص بندوں نے دکھی مخلوق خدا کی خدمت کے جذبے میں ہمیشہ دیا ہے، ☆کبھی نہ ختم ہونے والا دکھ جادو ☆ضدی جنات کی مسلسل شرارتیں نظر بد نے زندوں کو موت کے قریب کردیا ہو ☆رزق، کاروبار اور معاملات میں مسلسل بے برکتی ☆وقت کا زوال ☆دربدر کی ٹھوکریں ☆بچوں کی نافرمانی ☆ہر دلعزیز بننے کے لئے ☆عزت پانے کیلئے ☆ہر قسم کی بیماری کیلئے ☆حالات نے خودکشی پر مجبور کردیا ہو ☆روحانی ترقی کیلئے ☆اعلیٰ نوکری چاہیے ☆سٹوڈنٹس کیلئے ☆رزق، برکت، اور رحمت دروازہ توڑ کر آئے گی ☆بس یہ تعویذ آپ کے پاس ہو جو قدرت کا کرشمہ ہے، یہ ایک ایسا تعویذ ہے، جس کے لئے اگر یہ کہا جائے کہ سمندر کو کوزے میں بند کردیا ہے تو سچ ہوگا ☆نسلوں کی کامیابی ☆بے اولادی ☆دربدر کی ٹھوکریں ☆شادیوں کی بندش ☆کتے یا خنزیر کی کھوپڑی پر کیا ہوا خطرناک سفلی کالے جادو کا فوری طور پر حل۔'' (عبقری، اپریل ۲۰۱۷ء)

دوسرے اشتہار میں کہا گیا ہے:

خوشخبری! بہت بڑا اعزاز اور عظمت پانے کیلئے مختصر عمل

اپنی ناممکن پریشانیاں، غم، گھریلو الجھنیں اور ناکامیاں آپ کو سوفیصد مایوس کرچکی ہوں تو ایک عمل ایسا، جس سے بے شمار نے فائدہ لیا، وہ آپ بھی کریں، لیکن اسے صرف یقین والا ہی کرے گا، بے یقین شاید شک، بدگمانی یا مذاق کی نظر سے دیکھے، اپنی آمدنی یا تنخواہ میں سے اڑھائی فیصد نکالیں (یہ زکوٰۃ شمار نہیں ہوگی، اگر آپ زکوٰۃ دیتے ہیں تو وہ اس کے علاوہ ہوگی) اور اس رقم سے عبقری رسالہ یا حضرت حکیم صاحب کے درس کے میموری کارڈ مخلوق خدا کو اس کے سو فیصد فائدے سمجھا کر پھر گفٹ کریں، قارئین! آپ دوسروں کو خیر پہچائیں گے، لوگوں کا بھلا کریں، خیر اور بھلائی آپ کے دروازے توڑ کر آپ کی نسلوں تک آپ کا ساتھ دے گی اور مشکلات اور پریشانیاں چاہے کسی قسم کی بھی ہوں، حل ہوجائیں گی۔ یہ عمل اپنی زندگی کا معمول بنالیں۔'' (عبقری، اپریل ۲۰۱۷)

(۴)

یہ اشتہار ایسے ہیں، جو قارئین کو حضرت حکیم صاحب کے بارے میں روایتی صوفی وروایتی عامل ہونے کا تاثر دے رہے ہیں، اور اس تاثر کا پیدا ہونا ہم جیسے ان کے محبوں کے لیے اذیت کا موجب ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ ''عبقری'' رسالہ عملیات اور اسی قسم کے اشتہارات پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔

بہرحال حکیم صاحب جس محنت وجفاکشی سے اصلاح احوال کا کام کررہے ہیں، وہ قابل قدر وقابل تعریف ہے اور مادیت میں مستغرق انسانیت کو روحانیت کی طرف لانے کے سلسلہ میں حکیم صاحب کے اس کام کی افادیت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا، البتہ اگر حضرت حکیم صاحب کے اس کام میں اکابر بزرگان دین اور سلف صالحین سے ہمہ آہنگی موجود ہوتی تو ان کا یہ کام بہت زیادہ خیر وبرکت کا باعث ثابت ہوتا۔

اکابر بزرگانِ دین اور سلف صالحین کے ہاں اس بات کا خصوصی اہتمام موجود رہا ہے کہ انہیں شہرت، پبلسٹی اور تشہیر حاصل نہ ہو، اس لئے کہ شہرت کی تمنا وآرزو سے فرد کو محبوب کی طرف سے اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کی طرف (اس کی شہرت کی وجہ سے) انگلیاں اٹھنے لگیں، وہ حالت خطرہ میں ہے، سوائے ان کے جن کو اللہ بچائے۔

جب شہرت سے بے نیازی اور دوری کی روش غالب ہوتی ہے تو محبوب حقیقی کی طرف سے ایسی شخصیت کے لئے دلوں میں محبت ڈال دی جاتی ہے۔

دوسری بات جو اکابر بزرگان دین وسلف صالحین کی امتیازی خصوصیت رہی ہے، وہ فقر کا مزاج اور دنیا واہل دنیا سے ان کی بے نیازی کی روش رہی ہے، وہ دنیا واہل دنیا سے جتنا دور رہے، اسی قدر دنیا ذلیل ہوکر، اس کے سامنے آتی رہی، لیکن انہوں نے دنیا کو آخر وقت تک کوئی اہمیت نہیں دی، زہد، فقر، توکل، قناعت وغیرہ اہل اللہ کے ہاں یہ ساری چیزیں اس ہتھیار کی حیثیت رکھتی رہی ہیں، جس سے دلوں کو مفتوح کیا جاتا ہے۔

تیسری چیز جو اہل اللہ کے ہاں موجود رہی ہے، وہ تسخیری وظائف اور عملیات سے احتیاط کی روش رہی ہے، اللہ نے ان کے ذکر وفکر کے مجاہدوں میں ہی اتنی تاثیر رکھی کہ انہیں تسخیری وظائف اور عملیات کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

جو کام اکابر بزرگان دین اور سلف صالحین کے اصولوں وآداب سے ہمہ آہنگ ہوگا، وہ کام بہت زیادہ خیر وبرکت کا حامل ہوگا اور اس سے دین، روحانیت اور بزرگی کا سلف کا تسلسل بھی قائم رہے گا، دین وروحانیت کے سلف کے تسلسل کو قائم رکھنا، جہاں سب سے بڑی سعادت کی بات ہے، وہاں اس سے امت کی وحدت کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔

(۵)

شہرت اور لوگوں میں مقبولیت (جس کا ذکر اوپر ہوا) اہل اللہ اس سے کس قدر ڈرتے اور کانپتے رہتے تھے کہ اس کا اندازہ اس دور یعنی بیسویں صدی کے دو اہل اللہ کے واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

تبلیغ جماعت کے امیر حضرت مولانا محمد الیاس رحمتہ اللہ علیہ کے کام میں اللہ تعالیٰ نے جو برکت عطا فرمائی تھی اور انہیں زندگی میں ہی جو شہرت ومقبولیت دی تھی، وہ بے پناہ تھی، وہ اپنے اس کام کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ کہیں یہ استدراج نہ ہو۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ والد صاحب حضرت مفتی محمد شفیعؒ، مولانا الیاسؒ سے ان سے آخری دنوں میں ملنے کے لئے تشریف لے گئے، میں بھی والد صاحب کے ہمراہ تھا، (میری عمر چھوٹی تھی) والد صاحب سے انہوں نے کہا کہ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے کہ میرا شروع کردہ یہ تبلیغی کام میرے لئے استدارک میں داخل نہ ہوں (اس طرح میں آخرت میں الٹا پکڑا نہ جاؤں) والد صاحب نے انہیں اطمینان دلایا کہ آپ کا یہ کام استدراج میں ہرگز داخل نہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں حساس اور فکرمند ہیں، جب کہ استدراج کے حامل افراد اس سے بے فکر ہوتے ہیں، (اور وہ شہرت میں مگن رہتے ہیں) یہی اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا کام استدراج میں داخل نہیں، (یہاں استدراج کے مفہوم میں ڈھیل دینا اور دنیا میں ہی کام کے اثرات اور شہرت دے کہ آخرت کے اجر سے محروم کرنا وغیرہ شامل ہے)۔

حضرت مولانا الیاسؒ کا اسی طرح کا ایک واقعہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب ''یاد رفتگان'' میں لکھا ہے:

''لکھنو میں حاضرین سے مخاطب ہوکر آپ نے فرمایا، بھائیو، میں ایک ابتلا میں گرفتار ہوں، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اس سے نکالے، جب سے میں یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا ہوں، لوگ مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں، مجھے یہ خطرہ ہونے لگا ہے کہ مجھ میں اعجاب نفس (کبر کی ایک نوعیت) پیدا نہ ہوجائے اور میں اپنے کو بزرگ نہ سمجھنے لگوں، میں ہمیشہ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس ابتلا سے بسلامت نکال لیں، آپ بھی میرے حق میں دعا فرمائیں''۔

دوسرا واقعہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا ہے، جنہوں نے بھٹو کے دور حکومت

میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک کی قیادت کی تھی اور ان کی قیادت میں یہ تحریک الحمدللہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی، ان کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں (تحریک ختم نبوت کے زمانہ میں جب کہ) مولانا کا طوطی بول رہا تھا، اخبارات مولانا کی سرگرمیوں کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے، ان کی تقریریں اور بیانات شہ سرخیوں سے شایع ہوتے تھے، چنانچہ جب صبح ہوئی تو میزبانوں نے اخبارات کا پلندہ مولانا کے سامنے رکھ دیا، یہ اخبارات مولانا کے سفر کوئٹہ کی خبروں، بیانات، تقریروں اور تصویروں سے بھرے ہوئے تھے، مولانا نے یہ اخبارات اٹھا کر، ان پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر فوراً ہی ایک طرف رکھ دیا، اس کے بعد جب کمرے میں کوئی نہ رہا تو احقر سے فرمایا: ''آج کل جو تحریک، دین کے لئے چلائی جائے، اس میں سب سے بڑا فتنہ نام نمود کا فتنہ ہے، یہ فتنہ دینی تحریکوں کو تباہ کر ڈالتا ہے، مجھے بار بار یہ ڈر لگتا ہے کہ میں اس فتنہ کا شکار نہ ہوجاؤں، اور اس طرح یہ تحریک ڈوب نہ جائے، دعا کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس فتنے سے ہم سب کی حفاظت فرمائے، ورنہ یہ ہمارے اعمال کو تو بے وزن بناہی دے گا، اس مقدس تحریک کو بھی لے کر بیٹھ جائے گا۔

یہ فرماتے ہوئے مولانا کے چہرے پر کسی تصنع یا تکلف کے آثار نہ تھے، بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والی تشویش نمایاں تھی، (ماہنامہ بینات، جنوری، فروری ۱۹۷۸ء صفحہ ۵۴۴)

(۶)

حضرت حکیم محمد طارق محمود چغتائی صاحب کو اللہ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا ہے، سوشل میڈیا کے ذریعے لوگوں پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت، لکھنے کی غیر معمولی صلاحیت، لوگوں سے کام لینے کی صلاحیت، تنظیمی صلاحیت وغیرہ، پھر حضرت حکیم صاحب کی توانائی اور جسمانی قوت بھی بہتر ہے، ہم انہیں درخواست کریں گے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو افراد کے دلوں میں موجود اللہ کی محبت کے داعیے کو بیدار کرنے، ان پر انوار ذکر کو غالب کرنے اور اللہ سے ان کے تعلق کو مستحکم کرنے کے مقاصد میں صرف فرمائیں، ہماری نسلیں مادی نوعیت کی نفسیات اور مادہ پرستی کی طوفانی لہروں کی شدید زد میں ہیں، ان کے دلوں میں دنیا کی محبت رچ بس گئی ہے، ہماری ملت بالخصوص نئی نسلوں کے سارے مسائل، بے بسی اور بڑھتے ہوئے ڈپریشن کا بنیادی سبب ہی حب جاہ، حب مال، حرص وہوس، حسد اور رقیبانہ احساسات اور اہل مغرب کی مادی زندگی کی نفسیات ہے، نئی نسل کے ان مادی نوعیت کے سنگین احساسات، مسائل اور پریشانیوں کا حل ورد ووظائف کے ذریعہ انہیں دولتمند بنانے اور دنیاوی سرگرمیوں میں مستغرق کرنے سے وابستہ نہیں، تصوف، روحانیت اور وظائف کا مقصود دنیا، جسے قرآن نے متاع قلیل قرار دیا ہے، اور اللہ کے رسول نے اسے سمندر کے پانی کے قطرہ تشبیہ سے دی ہے، یہ ہرگز نہیں، اس سلسلہ میں حضرت حکیم صاحب کو ''تین راتوں میں مرادیں پوری'' ''میں دولتمند کیسے بنا'' ناممکن مسائل کا کچھ دنوں میں خاتمہ'' نہ ختم ہونے والا رزق- دولت کے ڈھیر'' جیسی کتابیں لکھنے اور ''عقبری'' رسالہ کو ان ساری چیزوں کو اہداف کی حیثیت سے پیش کرکے ذہن سازی کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں، جو ذہن اوراد ووظائف کے ذریعہ ایک بار دنیا بنانے کے خبط میں مبتلا ہوگیا، وہ دنیا سے دستبردار ہوکر، اللہ کی محبت کی راہ اختیار کرنے اور آخرت بنانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

بزرگان دین نے ہر دور میں مادیت پرستی کے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگوں کو اللہ کی راہ محبت کی طرف لگایا ہے، جب اللہ مقصود ہوجاتا ہے اور اللہ سے تعلق مستحکم ہونے لگتا ہے تو جملہ مسائل کے ازخود حل ہونے کی صورتیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور دنیا کے حوالے سے ھل من مزید کی حرص بھی ختم ہوجاتی ہے اور دنیا ذلیل ہوکر سامنے آتی ہے۔

حضرت حکیم صاحب اگر اپنی غیر معمولی ذہنی وعلمی صلاحیتوں وتوانائیوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا فرمائیں تو انشاء اللہ مادیت کے طوفان کی روک تھام کی بہتر صورت پیدا ہوگی، وظائف کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن ان کو فیصلہ کن اہمیت دینا اور اس کا دنیاوی مقاصد کے لیے استعمال کرنا سخت نقصان دہ ہے۔

(۷)

یہ نکتہ ذہن نشین ہونا بھی ضروری ہے کہ جب صوفی دنیا کو فیصلہ کن اہمیت دینے لگتا ہے تو دنیا کو ترجیح دینے کی اس کی نفسیات پختہ ہونے لگتی ہے اور اس کی سرگرمیوں کے پس پردہ لاشعور میں دنیاوی محرکات کارفرما ہونے لگتے ہیں، جب یہ ہوتا ہے تو پھر صوفی کو آزمائشوں میں مبتلا کردیا جاتا ہے، اس دور میں اس کی بڑی مثال ترکی کے مشہور ماڈرن صوفی فتح اللہ گولن کی ہے کہ وہ تصوف وبزرگی کے ذریعہ اربوں بلکہ کھربوں روپے کی املاک کے صاحب ہوگئے، دنیا کو ترجیح دینے کے نتیجہ میں اللہ نے اسے آزمائش میں مبتلا کیا اور عالمی استعمار سے مل کر، اس نے ترکی کی ملت اسلامیہ کے مفادات کی حامل اردگان کی حکومت کے خلاف فوجی بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی، اس کوشش میں اسے ناکامی کا سامنا ہونا پڑا اور ماڈرن صوفی کے لئے دنیا کو منہ دکھانا مشکل ہوگیا۔

اللہ ہمیں اس طرح کی آزمائشوں سے بچائے اور ہمیں سلف کے فقر کی راہ پر گامزن فرمائے اور اس راہ کو ہمارے لئے لذیذ اور محبوب تر بنادے۔

یہ معروضات بظاہر حضرت حکیم محمد طارق محمود چغتائی صاحب کے حوالے سے پیش کی گئی ہیں، لیکن بباطن دراصل اپنے آپ کو بھی آئینہ دکھانا تھا کہ اپنی حالت بھی اس سے مختلف نہیں کہ نفس شہرت چاہتا ہے، دولت چاہتا ہے، معاشرہ میں عزت چاہتا ہے، قیادت وسیادت چاہتا ہے، اور جدید دور کی ساری آسائشوں سے متمتع ہونا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرماکر، ہم سب کی اصلاح کی صورت پیدا فرمائے، اور ہمیں سلف صالحین کی قرآن وسنت سے ماخوذ راہ پر چلائے، جس کی دعا ہم روزانہ نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے کرتے رہتے ہیں۔ **اھدناالصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم.**